اکتوبر - دسمبر ۲۰۱۶ء

ISSN: 2321-8339

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

اسلام کا فکری انقلاب اور دور حاضر کے تقاضے
سید جلال الدین عمری

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیماتِ امن
ڈاکٹر تنویر قاسم

مصر میں آزادی نسواں کی تحریک
ڈاکٹر جاں نثار معین

اسلامی ریاست میں مذہبی آزادی
ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی

تحریکاتِ اسلامی کی علمی وفکری ترجیحات
ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی

تعارف وتبصرہ

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

اکتوبر ——— دسمبر ۲۰۱۶ء

مدیر

سیّد جلال الدین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

نبی نگر (جمال پور)، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ — ۲۰۲۰۰۲

ISSN: 2321-8339

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ

جلد: ۳۵ شمارہ: ۴

محرم ——— ربیع الاول ۱۴۳۸ھ

اکتوبر ——— دسمبر ۲۰۱۶ء

- مجلہ کے تمام شمارے www.tahqeeqat.net پر لوڈ کر دیے گئے ہیں۔
- مقالہ نگار حضرات اپنے مقالات صرف tahqeeqat@gmail.com پر ارسال کریں۔
- انتظامی امور سے متعلق رابطہ کے ذرائع:

فون: 0571-2902034 موبائل: 08126677681

ای میل: idaratahqeeq2016@gmail.com

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ	۴۰ روپے
سالانہ	۱۵۰ روپے
پانچ سال کے لیے	۶۰۰ روپے
سالانہ (لائبریریاں وادارے)	۲۰۰ روپے

برائے پاکستان

سالانہ (انفرادی)	۲۰/امریکی ڈالر
سالانہ (ادارے)	۲۵/امریکی ڈالر

برائے دیگر ممالک

سالانہ (انفرادی)	۲۵/امریکی ڈالر
سالانہ (ادارے)	۳۰/امریکی ڈالر

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے بھارت آفسیٹ دہلی — ۶ سے چھپوا کر

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، نبی نگر (جمال پور)، علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

اسلام کا فکری انقلاب اور دور حاضر کے تقاضے — سید جلال الدین عمری — ۵

تحقیق وتنقید

حضرت عیسیٰؑ کی تعلیماتِ امن — ڈاکٹر تنویر قاسم — ۱۹

مصر میں آزادی نسواں کی تحریک

اور اس کے اثرات — ڈاکٹر جاں نثار معین — ۳۷

بحث ونظر

اسلامی ریاست میں مذہبی آزادی — ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی — ۵۷

تحریکاتِ اسلامی کی علمی وفکری ترجیحات — ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی — ۷۹

تعارف وتبصرہ

اِقسام الأیمان فی اَقسام القرآن — ڈاکٹر الطاف احمد مالانی — ۱۰۵

معرفۃ الحرام فی شریعۃ الاسلام — ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۰۶

تصوف کی حقیقت — جناب محمد اسعد فلاحی — ۱۰۷

فکر اسلامی کا ارتقاء — ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی — ۱۱۰

خبر نامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۶۱) — ۱۱۵

سالانہ فہرست مضامین ومضمون نگاران تحقیقات اسلامی ۲۰۱۶ئ — ۱۱۷

مضامین کا انگریزی خلاصہ — ۱۲۱—۱۲۸

اس شمارے کے لکھنے والے

۱— ڈاکٹر تنویر قاسم
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامی، یونی ورسٹی آف انجینیر نگ اینڈ ٹکنالوجی، لاہور
tanveerqasim@yahoo.com

۲— ڈاکٹر جاں نثار معین
ڈپارٹمنٹ آف ویمن اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، حیدر آباد۔ ۳۲
jannisarmoin1@gmail.com

۳— ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی
شعبۂ دینیات (سنی) علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ
zafardarik85@gmail.com

۴— پروفیسر عبید اللہ فہد فلاحی
شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ
drfahadamu@yahoo.com

۵— ڈاکٹر الطاف احمد مالانی
جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ (سعودی عرب)
aamalani@hotmail.com

۶— ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
سکریٹری تصنیفی اکیڈمی، جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی
mrnadvi@gmail.com

۷— جناب محمد اسعد فلاحی
معاون شعبۂ تصنیفی اکیڈمی، جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی
asadmazharfalahi@gmail.com

۸— ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
مدیر ماہ نامہ 'ندائے اعتدال' علی گڑھ
nidaeaetidal@gmail.com

۹— سید جلال الدین عمری
صدر ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ

حرف آغاز

اسلام کا فکری انقلاب
اور دورِ حاضر کے تقاضے

——————— سید جلال الدین عمری

جماعت اسلامی ہند کی سرپرستی میں طلبہ اور نوجوانوں کی کل ہند تنظیم اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا (S.I.O) نے ۷۔ ۸/اکتوبر ۲۰۱۶ء میں انڈیا اسلامک کلچر سینٹر نئی دہلی میں ایک بین الاقوامی کانفرنس 'انڈیا انٹرنیشنل اسلامک اکیڈمک کانفرنس' کے عنوان سے منعقد کی، جس میں ملک کی مختلف یونی ورسٹیوں کے ریسرچ اسکالرس اور محققین و دانش وران کے علاوہ بیرونِ ملک سے بھی اہل علم کی ایک بڑی تعداد شریک ہوئی۔ اس کے افتتاحی اجلاس میں مولانا سید جلال الدین عمری، امیر جماعت اسلامی ہند نے بہ حیثیت سرپرستِ تنظیم جو کلیدی خطبہ پیش کیا تھا، اس کے منتخب حصے ان کی نظر ثانی کے بعد افادۂ عام کے لیے یہاں پیش کیے جارہے ہیں۔

(رضی الاسلام)

اسٹیج پر تشریف فرما عمائدین اور اصحاب علم و دانش اور محترم شرکائے اجلاس، بزرگو، نوجوانو اور عزیزو، محترم خواتین! میں آپ سب کا اس کانفرنس میں دل سے خیر مقدم کرتا ہوں۔

یہ ہم سب کے لیے باعث مسرت ہے کہ ہمارے ملک کی طلبہ اور نوجوانوں کی سب سے بڑی مسلم تنظیم Students Islamic Organization Of India

نے وقت کے ایک اہم علمی و فکری عنوان پر India International Islamic Academic Conference کا اہتمام کیا ہے۔ اس کے لیے بعض قدیم و جدید موضوعات کا ان کے وسیع پس منظر میں انتخاب بھی کیا ہے۔ توقع ہے، بحث و مباحثہ کے بعد مزید کچھ نئے گوشے سامنے آئیں گے اور اس طرح کے موضوعات سے دل چسپی پیدا ہوگی۔

علم کی اہمیت بالکل واضح ہے۔ علم انسان کو دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتا ہے، اس سے اس پر ترقی کی راہیں کھلتی ہیں، وہ ماضی اور حال سے نکل کر مستقبل کو دیکھنے کے قابل ہوتا ہے اور سماج کی بہتر خدمت انجام دے سکتا ہے۔ قوموں کی ترقی بھی علم ہی کی راہ سے ہوتی ہے۔ جو قومیں علم کے میدان میں پیش قدمی کرتی ہیں ان ہی کو قیادت کا مقام حاصل ہوتا ہے اور دنیا میں ان کا اعتبار قائم ہوتا ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام نے زبردست فکری انقلاب برپا کیا۔ دنیا نے اس کے نتائج بھی دیکھے۔ اس پس منظر میں موجودہ دور کے تقاضوں پر بعض باتیں یہاں عرض کی جارہی ہیں۔ امید ہے، قابل توجہ قرار پائیں گی۔

اسلام اللہ تعالیٰ کا دین ہے۔ اس کی اساس انسان کی صحیح فطرت اور اس کی عقل سلیم ہے۔ وہ دینِ حق ہے اور دلیل اور حجت سے اپنی حقانیت ثابت کرتا ہے۔ انسان کی عقل اور فطرت پر بسا اوقات بے اصل عقائد، مزعوماتِ باطلہ اور غلط روایات کے پردے پڑ جاتے ہیں۔ اسلام ان پردوں کو چاک کرتا اور راہِ حق واضح کرتا ہے۔ یہ اسلام کا احسان ہے کہ وہ انسان کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر علم کی تابانی عطا کرتا ہے۔ وہ انسان کو فکری جمود اور نظری تعصّبات کو ختم کرنے اور اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی پیدا کردہ اس وسیع کائنات، انسان سے اس کے تعلق اور زندگی پر اس کے اثرات پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

كِتٰبٌ أَنزَلْنٰهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ (ابراہیم:۱)

(یہ کتاب ہے جو ہم نے آپ پر نازل کی ہے، تا کہ آپ لوگوں کو ان کے رب کے حکم سے ظلمتوں سے نکال کر روشنی میں لائیں، اس اللہ کے راستہ کی طرف جو ہر طرح غالب اور ستودہ صفات ہے۔)

وہ اللہ کی کتاب پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، تا کہ آدمی دن کی روشنی میں اس کی صداقت کا فیصلہ کر سکے:

كِتَٰبٌ أَنزَلْنَٰهُ إِلَيْكَ مُبَٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوٓا۟ ءَايَٰتِهِۦ وَلِيَتَذَكَّرَ أُو۟لُوا۟ الْأَلْبَٰب (ص: ۲۹)

(یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے، تا کہ وہ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل منداس سے نصیحت حاصل کریں۔)

قرآن مجید کے اولین مخاطب عرب تھے۔ وہ بار بار انہیں عقل وفہم سے کام لینے اور اس کی تعلیمات پر غور وفکر کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ (ملاحظہ ہو یوسف: ۲۷۔ الزخرف: ۲، ۳۔ الانبیائ: ۱۰)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا:

قُلْ هَٰذِهِۦ سَبِيلِىٓ أَدْعُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا۠ وَمَنِ ٱتَّبَعَنِى وَسُبْحَٰنَ ٱللَّهِ وَمَآ أَنَا۠ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ (یوسف:۱۰۸)

(کہہ دو کہ یہ میرا راستہ ہے۔ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ میں خود بھی بصیرت کے ساتھ اس پر عمل کر رہا ہوں اور میری اتباع کرنے والے بھی اسی بصیرت کے حامل ہیں۔ اللہ کی ذات شرک سے پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔)

بصارت سے آدمی ان چیزوں کو دیکھتا ہے جو آنکھوں کی گرفت میں آتی ہیں۔ بصیرت کے ذریعہ وہ غیر مرئی اور غیر محسوس حقائق کے بارے میں حق و باطل اور درست و نادرست کا فیصلہ کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ میں اور میرے ساتھی جس راستہ کی طرف بلا رہے ہیں وہ کوئی اندھا عقیدہ نہیں ہے، جس کے پیچھے ہم دوڑے چلے جا رہے ہیں، بلکہ وہ

دلیل و برہان کے ذریعہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے اور اس کی حقانیت پر ہمیں پوری طرح شرح صدر اور اطمینان حاصل ہے۔ یہ راستہ توحید کا ہے، شرک کا نہیں ہے۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ کے جتنے رسول آئے وہ دلیل ہی سے اپنی بات پیش کرتے اور اپنی صداقت کا ثبوت فراہم کرتے تھے۔ وہ اپنے عقیدے کو مخاطب پر مسلط نہیں کرتے تھے، بلکہ کھلی فضا میں اس پر غور وفکر کی دعوت دیتے تھے۔ حضرت نوحؑ، جو حضرت آدمؑ کے بعد سب سے پہلے صاحب شریعت پیغمبر تھے، فرماتے ہیں:

يٰقَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّيْ وَ اٰتٰنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَ أَنتُمْ لَهَا كٰرِهُون (ھود:۲۸)

(اے میری قوم کے لوگو! تم خود بتاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر قائم ہوں اور اللہ نے مجھے اپنے پاس سے رحمتِ خاص (نبوت) عطا کی ہے اور وہ نبوت اور دلیلِ نبوت تمہاری آنکھیں نہیں دیکھ رہی ہیں تو کیا ہم اسے زبردستی تم پر چپکا سکتے ہیں، جب کہ تم اسے ناپسند کر رہے ہو۔)

جو قوم دلیل کے مقابلہ میں غیر عقلی روش اختیار کرتی، ضد، ہٹ دھرمی اور مکابرت کا مظاہرہ کرتی اور اللہ کے رسولوں کے درپے آزار ہوجاتی وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آجاتی۔ اللہ تعالیٰ کے اس قانون کا ذکر ایک جگہ ان الفاظ میں ہوا ہے:

جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ثُمَّ أَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ (فاطر:۲۵۔۲۶)

(ان کے پاس ان کے رسول کھلے دلائل اور صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے۔ پھر جن لوگوں نے انکار کیا انہیں میں نے پکڑ لیا۔ دیکھو کہ میری گرفت کیسی تھی؟)[۱]

اللہ تعالیٰ کا وجود اور اس کی وحدانیت اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ جو قومیں شرک میں مبتلا تھیں ان کا سرمایۂ علم تقلیدِ آباء تھا۔ وہ باپ دادا کی

[۱] اللہ تعالیٰ کا یہ قانون قرآن مجید میں متعدد مواقع پر تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ مثال کے ملاحظہ ہو سورۂ ابراہیم، آیات: ۹۔۱۴

روایت کو حجت مانتی تھیں، اس کے پیچھے فہم و بصیرت نہیں تھی۔ حالاں کہ بے دلیل کسی روایت سے چپکے رہنا، جب کہ دلائل سے اس کی کم زوری بھی واضح ہو چکی ہو، انتہائی بے دانشی ہے:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (البقرۃ: ۱۷۰)

(جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو دین نازل کیا ہے اس کی اتباع کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس طریقہ پر چلیں گے جس پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا وہ اس صورت میں بھی ان کی اتباع کریں گے، جب کہ وہ نہ تو کچھ سمجھتے رہے ہوں اور نہ ان کو راہِ ہدایت ملی ہو۔) [۱]

روایت پرستی کبھی مذہبی تقدس کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور اسے خدائی ہدایت تصور کیا جانے لگتا ہے۔ قرآن نے کہا کہ اس کے لیے سند چاہیے۔ بغیر سند کے اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ کسی عمل کی خدا کی طرف نسبت بغیر ثبوت کے جرم عظیم ہے۔ اس کی سزا مل کر رہے گی:

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِن شَيْءٍ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا قُلْ هَلْ عِندَكُم مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ (الانعام: ۱۴۸)

(جنہوں نے شرک کیا وہ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک کرتے نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ ہم کسی چیز کو حرام قرار دیتے۔ اسی طرح ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی رسولوں کی تکذیب کی۔ بالآخر انہوں نے ہمارے عذاب کا مزا چکھا۔ ان سے پوچھو کہ کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے کہ اسے ہمارے سامنے پیش کر سکو۔ تم تو محض گمان کے پیچھے چل رہے ہو اور اٹکل سے تیر چلا رہے ہو۔)

اہل کتاب میں نسلی غرور تھا۔ وہ خود کو ابناء اللہ کہتے اور اللہ کے محبوب و

---

[۱] نیز ملاحظہ ہو: المائدہ: ۱۰۴

مقرب تصور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک صرف وہی اللہ کی رحمت اور جنت کے مستحق تھے۔ قرآن نے ان کے اس خیالِ خام کی تردید کی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ سب کا ہے۔ اس کا کسی سے نسبی تعلق نہیں ہے:

وَقَالُوا لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (البقرۃ:۱۱۱)

(وہ کہتے ہیں کہ جنت میں ہرگز داخل نہ ہوگا مگر وہ جو یہودی ہے یا نصرانی۔ یہ ان کی خواہشات ہیں۔ ان سے کہو کہ تم اپنی دلیل پیش کرو اگر تم اپنے دعوی میں سچے ہو۔)

یہود و نصاریٰ کے درمیان بہت سے اختلافات تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی تکفیر کرتے اور ان میں سے ہر ایک خود کو جنت کا مستحق قرار دیتا۔ قرآن نے کہا کہ یہ تمہاری خواہش اور تمنا تو ہوسکتی ہے، اس کی کوئی دلیل تم نہیں پیش کر سکتے۔ اس کے بعد اللہ کا قانون ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِندَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (البقرۃ:۱۱۲)

(ہاں! جس کسی نے اپنا رخ پوری طرح اللہ کی طرف کیا اور نیک روش اختیار کی تو اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے نہ خوف ہے اور وہ غم گیں ہوں گے۔)

یہ دراصل مذہبی مزعومات اور بے دلیل دعووں کا مسکت جواب ہے۔

دورِ حاضر میں عقیدہ اور مذہب کی آزادی کو انسان کا ایک بنیادی حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے بہت پہلے اسے یہ حق دیا۔ اس نے صراحت کے ساتھ کہا: لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ۔ (البقرۃ:۲۵۶) یہ اس بات کا اعلان ہے کہ عقیدے کے معاملہ میں جبر و اکراہ ناروا ہے۔ اس کی کسی صورت میں اجازت نہیں دی جاسکتی۔ کسی مذہب یا عقیدے کی صداقت معلوم کرنے کے لیے اس نے گفتگو، تبادلۂ خیال اور بحث و مباحثہ کی راہ دکھائی ہے۔ ارشاد ہے:

ادْعُ إِلِى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُم بِالَّتِىْ هِىَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيْلِهِ وَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْن (النحل:۱۲۵)

مطلب یہ کہ تم اس راستہ کی طرف بلاؤ جو تمہارے رب کا بتایا ہوا ہے، جو اس کی رضا اور خوش نودی کا باعث ہے اور جس پر گام زن ہوکر انسان دنیا اور آخرت کی فوز و فلاح سے ہم کنار ہوسکتا ہے، لیکن اس کے لیے حکمت، موعظہ حسنہ اور جدالِ حسن کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ حکمت، دین کی معنویت کو واضح کرنے کا نام ہے۔ موعظہ حسنہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت سے خطاب ہو اور اس کے پاکیزہ جذبات سے اپیل کی جائے۔ جدالِ احسن یہ ہے کہ آدمی دوسرے کی بات سنے اور اپنا نقطہ نظر سنجیدگی سے پیش کرے اور اسے دلائل سے ثابت کرے۔ اس کے آداب بھی قرآن نے بتائے ہیں۔ یہ علمی اور فکری دنیا میں ایک انقلاب تھا کہ عقیدے کو جبر سے آزاد ہونا چاہیے اور دلائل سے اس پر گفتگو ہونی چاہیے۔

علم وفکر کے جس راستہ کی اسلام نے راہ نمائی کی، اس کے ماننے والے اس پر گام زن رہے اور جس وقت جو علمی تقاضے ابھرے ان کی تکمیل کی۔ رسول اکرم ﷺ کی رحلت کی بعد حضرت ابوبکرؓ نے صحابۂ کرام کے مشورے سے جمع وترتیبِ قرآن کی خدمت انجام دی اور مصحف مرتب فرمادیا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے دور خلافت میں اس کے نسخے اسلامی سلطنت کے اطراف واکناف میں پہنچادیے اور اسی کے مطابق کتابت وتلاوت کا حکم نافذ کردیا۔ آج یہی مصحف ہے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اسے اسلامی علوم کی ترویج کا آغاز کہنا چاہیے، جس نے بعد میں ہمہ جہت رخ اختیار کیا۔

یہیں سے متعلقاتِ قرآن، تفسیر، اصولِ تفسیر، حدیث، اصولِ حدیث، سیرت، تاریخ، اسماء الرجال، فقہ اور اصولِ فقہ جیسے علوم وجود میں آئے، جنہیں

اصطلاح میں دینی یا شرعی علوم کہا جاتا ہے۔ ان علوم میں بڑے بڑے اساطینِ علم، فقہائ، محدثین اور مورخین کو دنیا نے دیکھا۔ اسی میں ادب، لغت،، نقد ادب کی وہ خدمت انجام پائی جس کا مقابلہ دنیا کا کوئی ادب شاید نہیں کرسکتا۔

ایک مرحلہ میں، خاص طور پر عباسی دور میں یونانی علوم منتقل ہوئے۔ ان میں طب، ریاضی، صنعت وحرفت اور فلکیات جیسے طبیعی اور سائنسی علوم کے ساتھ فلسفہ اور الٰہیات بھی شامل تھے۔ ان کی اشاعت سے اسلام کے مبادی اور اساسات پر عقلی بحثیں شروع ہوئیں اور امت میں بہت سے گم راہ فرقے وجود میں آئے۔ فارابی، ابن سینا، رازی، غزالی، ابن رشد اور ابن تیمیہ جیسے محققین نے یونانی علوم کا گہرائی سے جائزہ لیا، اس کی کم زوریاں واضح کیں اور مخالفین و معاندین کے علاوہ امت میں جو فتنے ابھر رہے تھے، ان کا جواب دیا۔ اس سے علم کلام وجود میں آیا۔

یہ ایک زبردست علمی تحریک تھی جو چار صدیوں تک پوری قوت کے ساتھ جاری رہی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی تابانی ماند پڑنے لگی۔ قدیم تحقیقات و مباحث تو باقی رہے، لیکن تحقیق کے نئے گوشے تلاش نہیں کیے جاسکے۔ اجتہادی فکر اور آزادانہ نقد ونظر کی جگہ علمی جمود نے لے لی۔ اس میں شک نہیں، اس کے بعد بھی ایسے ماہرینِ علم اور ائمہ دین پیدا ہوتے رہے جن کی صلاحیت اور قابلیت اور دینی فہم پر امت کو اعتماد رہا ہے اور جن کی خدمات سے اسلامی تاریخ کے ابواب روشن ہیں، لیکن پورے عالمِ اسلام میں جو علمی فضا تھی وہ دوبارہ بحال نہ ہوسکی۔

اس صورتِ حال پر صدیاں گزر گئیں۔ اس کے وجوہ واسباب پر بحث کی اس وقت ضرورت نہیں ہے۔ دورِ جدید نے حالات بدل دیے ہیں۔ اب ہمارا سابقہ نئے حالات اور مسائل سے ہے۔ پوری دنیا ایک عالمی بستی (GLOBAL VILLAGE) کی شکل اختیار کرچکی ہے۔ اس میں نئے علمی چیلنجز کا سامنا ہے۔ اس کے لیے دورِ حاضر میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر پائے جانے والے فکری و عملی

سوالات کا بے لاگ تجزیہ کرنا اور ان کے سلسلہ میں اسلام کا موقف پیش کرنا ہوگا۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ موجودہ مسائل اور ان کی پیچیدگیوں سے بھرپور آگہی کے ساتھ قرآن وحدیث کے نصوص، ان کے مفہوم ومنشا، ان کے اشارات اور مقتضیات سے بخوبی واقفیت ہو۔اس سلسلہ میں ہمارے اسلاف کی جو قابلِ قدر اور ناقابلِ فراموش خدمات ہیں، ان سے لازماً استفادہ کرنا ہوگا اور جہاں اجتہاد کی ضرورت ہو، اجتہاد بھی کرنا ہوگا اور نئی راہیں تلاش کرنی ہوں گی۔

موجودہ دور میں اسلامی نقطۂ نظر سے جن مسائل نے نمایاں اہمیت اختیار کرلی ہے، ان میں سے بعض کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے:

۱۔ اسلام اور امن عالم: اس وقت اسلام کو امن مخالف مذہب کی حیثیت سے پیش کیا جارہا ہے اور اسے دہشت گردی کا محرک قرار دیا جارہا ہے۔ دہشت گردی کے ہر واقعہ کو اسلام سے جوڑنے کی سعی کی جارہی ہے۔ اس کی ایک وجہ بعض وہ تحریکات بھی ہیں جو اسلام کے نام پر دہشت گردی پھیلا رہی ہیں۔

۲۔ دور حاضر میں اسلام کی معنویت اور اس کا قابل عمل ہونا۔

۳۔انسان کے ذرائع علم کی محدودیت، ان کا نقص، وحی ورسالت کی ضرورت اور اس کا اثبات۔

۴۔ احکام شریعت کی حکمت اور معنویت۔ اس میں عبادات اور اخلاق سے لے کر معاشرت وسیاست تک سب ہی احکام آتے ہیں۔

۵۔مقاصدِ شریعت اور ان کی تکمیل کس طرح ہوسکتی ہے؟

۶۔ترجیحاتِ دین: احکام شریعت میں بعض کو بعض پر ترجیح حاصل ہے۔ یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کی بنیادی تعلیمات کی روشنی میں حالات کے لحاظ سے ان ترجیحات میں کیا تبدیلی ہوسکتی ہے؟

۷۔امت کا چالیس فی صد (۴۰٪) حصہ دنیا کے مختلف ممالک میں اقلیت

میں ہے۔ ان کے بعض مسائل مسلم ممالک سے الگ نوعیت کے ہیں۔ اس سلسلے میں فقہ الاقلیات ایک مستقل موضوع ہے۔

۸۔ اسی ذیل میں رخصت اور عزیمت، ضرورت اور اضطرار کے پہلو بھی زیر بحث آتے رہے ہیں۔

۹۔ جہاد اور اس کے احکام: اسلام کی جن تعلیمات کو خاص ہدف تنقید بنایا جاتا ہے ان میں جہاد بھی ہے۔ اسے امن عالم کے لیے سنگین خطرہ بتایا جاتا ہے۔ اس کے احکام کی وضاحت ضروری ہے۔

۱۰۔ اسلامی ریاست کے غیر اسلامی ریاست سے تعلقات۔

بعض اور موضوعات کا بھی اس میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عالمِ اسلام کے بعض معتبر اہلِ علم نے ان موضوعات پر اور ان جیسے دیگر موضوعات پر عمدہ خدمات انجام دی ہیں۔ ان کا تعلق عرب اور عجم دونوں سے ہے، لیکن ان کے درمیان ربط اور تبادلۂ خیال کی کوئی ٹھوس شکل نہیں نکل سکی ہے۔ کبھی کبھی سمپوزیم اور سمینار ہوجاتے ہیں، لیکن اس سے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا، حالاں کہ آج کے دور میں انٹرنیٹ کی وجہ سے باہم ربط کے امکانات ہیں۔ اس کی کوئی صورت ضرور نکلنی چاہیے۔

دور حاضر میں مختلف جہات سے جو علمی خدمات انجام پارہی ہیں، کھلے دل سے ان کے اعتراف کے ساتھ بعض باتیں ان احباب سے عرض کی جارہی ہیں جو اپنے اندر یہی پاک جذبہ رکھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے دو ایک پہلو ان اصحاب کے لیے بھی قابل توجہ ہوں جو عملاً اس میدان میں سعی بلیغ کررہے ہیں۔

۱۔ عربی زبان کی اہمیت بہت واضح ہے۔ قرآن و حدیث دین کے اصل مآخذ ہیں۔ ان سے استفادہ براہِ راست عربی زبان ہی کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔ ثانوی مآخذ اور تراجم کی مدد سے دینی موضوعات پر تحقیق کا حق کبھی ادا نہیں ہوسکتا۔ اسی

طرح اسلامی علوم کا بڑا ذخیرہ عربی زبان میں ہے۔ کسی موضوع پر تحقیق کو آگے بڑھانے کے لیے ماضی کے سرمایہ سے واقفیت لازمی ہے۔ عربی زبان کی اہمیت کے اور بھی پہلو ہیں۔

۲۔ دور حاضر میں تحقیق کا معیار کافی بلند ہے۔ اس کے مخصوص تقاضے ہیں۔ اس کے لیے وسائل کی فراوانی بھی ہے۔ اب معلومات کے حصول کے لیے لائبریریوں میں جانے اور متعلقہ مواد کو جمع کرنے کے لیے کتابوں کو کھنگالنے کی ضرورت نہیں۔ اب لائبریریاں خود آدمی کے لیپ ٹاپ میں موجود ہیں۔ جو کام ہفتوں میں ہوتا تھا وہ اب لمحوں میں ہوتا ہے۔ کسی بھی موضوع پر اعداد و شمار، جو برسوں کی محنت سے جمع کیے جاتے ہیں اور جن سے دنیا متاثر ہوتی ہے، وہ بغیر محنت کے دست یاب ہیں۔ اس سے فائدہ اٹھا کر بہت سے مزعومات کو 'تحقیق' کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ جو اصحاب، اسلام کی علمی مساعی میں حصہ لینا چاہتے ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان تمام سہولتوں سے بھرپور استفادہ کریں۔ ان سے خام مواد حاصل کریں اور اسلام کی روشنی میں ان کی خامیاں اور کمزوریاں واضح کریں اور ان کی تحقیق آج کے معیار سے ہم آہنگ ہی نہیں، بلکہ اس سے بلند ہو۔ اسی وقت یہ دوسروں کو متوجہ کر سکے گی۔

۳۔ اسلام نے اساسی عقائد کے ساتھ ایک نظام شریعت بھی دیا ہے جو پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ ایک ابدی قانون ہے۔ ہر دور میں اس پر عمل ہوسکتا ہے۔ یہ کسی بھی دور میں ناقابل عمل نہیں ہے۔ اس میں انسان کی ضروریات، مجبوریوں اور حالات زمانہ کی رعایت پائی جاتی ہے۔ دین کے آسان اور قابل عمل ہونے کی قرآن میں بار بار صراحت کی گئی ہے۔ جیسے لاَ یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْساً إِلاَّ وُسْعَھا۔ البقرۃ: ۲۸۶۔ (اللہ کسی نفس پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا)۔ وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِیْ الدِّیْنِ مِنْ حَرَج ۔ الحج: ۷۸۔ (اللہ تعالیٰ نے دین میں تمہارے لیے تنگی نہیں رکھی ہے)۔ یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلاَ یُرِیْدُ بِکُمُ

الْعُسْر۔البقرۃ: ۱۸۵۔(اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، سختی اسے منظور نہیں ہے۔ یا اس نے سماج کے معروفات کو اہمیت دی ہے۔ معاشرتی احکام کے سلسلے میں فرمایا: وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ۔النسائ:۹۹۔(عورتوں کے ساتھ معروف کے مطابق سلوک کرو)۔ یا والدین کے متعلق کہا: وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا۔لقمان:۱۵۔(دنیا میں والدین کے ساتھ اس طرح برتاؤ کرو، جو معروف ہے)۔

فقہاء کرام نے ان قرآنی تعلیمات کی روشنی میں رفع حرج کے اصول وضع کیے ہیں، جن سے ان کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ اس پر غور کرتے وقت یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ان اصول کا انطباق کہاں فرد پر ہوگا اور کہاں جماعت پر؟ اور ان حالات کا بھی باریک بینی سے جائزہ لینا ہوگا جن میں ان پر عمل ہوسکتا ہے۔ بنو اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کے احسانات، ان کی ناسپاسی، نفسانی اغراض کے لیے دین میں اختلاف اور اس سے انحراف کے تذکرہ کے بعد فرمایا: ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔الجاثیۃ:۱۸۔(پھر ہم نے آپ کو دین کے معاملہ میں ایک شریعت پر کردیا۔ آپ اس کی اتباع کریں اور ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلیں جو علم نہیں رکھتے) اس لیے ان اصول کی ایسی تعبیر وتشریح نہیں ہونی چاہیے جس سے شریعت کی اہمیت کم ہو، اس پر عمل کا جذبہ کم زور پڑنے لگے اور حالات کی سختی اور سہولت کے نام پر احکام شریعت سے فرار کا ذہن نہ بننے پائے۔

۴۔ آدمی اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑا مفکر بھی ماحول کے اثرات سے پوری طرح آزاد نہیں ہو پاتا۔ اسلامی مفکرین بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ہر اسلامی مفکر نے اپنے دور کے علمی تقاضوں کی تکمیل اور فکری خامیوں کو رفع کرنے کی سعی کی۔ اس سلسلہ میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ یہ مفکرین خود اپنے دور کے افکار اور رجحانات سے کہیں متاثر تو نہیں ہیں؟ اور کیا انہوں نے قرآن وحدیث کا آزادانہ مطالعہ کیا ہے؟ اسی طرح یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ ان پر ماحول کا ردعمل تو نہیں

تھا؟اس لیے کہ ردعمل میں اعتدال و توازن باقی نہیں رہتا۔ اس کے بعد ان فکری کوششوں کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے۔ اسی بنیاد پر ہم اپنی علمی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں اور جن ائمہ دین اور محققین کی خدمات اپنے لیے باعثِ فخر تسلیم کرتے ہیں، ان کے بارے میں ہمارا یہ یقین ہے کہ ان کی کوششیں گو ایک خاص دور میں اور خاص ماحول میں تھیں، لیکن اس کے اثرات سے ممکنہ حد تک آزاد رہی ہیں۔

موجودہ دور کی اساس الحاد پر ہے۔ اس کی اخلاقیات، تہذیب، معاشرت، قانون اور سیاست سب اس کے تابع ہیں۔ اس کے حق میں اس نے پوری فضا قائم کی ہے اور علمی بنیادوں پر اسے استوار کرنے کی غیر معمولی سعی کی ہے۔ پوری دنیا اس سے متاثر ہی نہیں، مرعوب بھی ہے۔

امت مسلمہ پر بھی اس کے اثرات ہیں۔ ہماری موجودہ نسل کی تعلیم و تربیت ان ہی کے اداروں میں ہو رہی ہے اور وہی ان کی ذہن سازی کر رہے ہیں۔ مغرب میں جو مسلمان آباد ہیں وہ اسی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ ان کا دینی پس منظر بھی بہت مضبوط نہیں ہے۔ ہمارے مطالعہ اور تحقیق کا اس فضا سے متاثر ہونا تعجب خیز ہرگز نہ ہوگا۔ اس لیے اس بات کی شعوری کوشش کرنی ہوگی کہ اس کے اثرات سے ممکنہ حد تک آزاد ہو کر اسلام کا مطالعہ کیا جائے۔ اس کے لیے باہم مشورہ اور ایک دوسرے کے کام کا جائزہ لینا ہوگا اور دیکھنا ہوگا کہ کس حد تک اسلامی تعلیمات کی ترجمانی ہو رہی ہے اور کہاں لغزشیں ہو رہی ہیں۔ اس سے امید ہے، اسلامی ریسرچ اور تحقیق کا عمل صحیح رخ پر آگے بڑھ سکے گا۔

پاکستان میں سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی کے لیے رابطہ کریں:
جناب سجاد الٰہی صاحب، A-27، لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور
Tel: 0300-4682752, (R)5863609, (O)7280916
Email: abdulhadi_133@yahoo.com

وقت کے ایک اہم اور زندہ موضوع پر قابلِ قدر تصنیف

غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق

مولانا سید جلال الدین عمری

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کیسے تعلقات ہونے چاہئیں؟ یہ آج کا ایک اہم اور زندہ موضوع ہے۔ کیا اسلام اپنے ماننے والوں کے علاوہ دوسروں کو بنیادی انسانی حقوق سے محروم کر دیتا ہے؟ کیا اس میں مذہبی رواداری، تحمل و برداشت اور توسع نہیں پایا جاتا ہے؟ اسلام کے نزدیک غیر مسلموں سے خاندانی، معاشرتی، سماجی، کاروباری اور ازدواجی تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ غیر مسلموں کو سلام، مساجد میں ان کا داخلہ اور ان سے تحائف کے تبادلہ کا کیا حکم ہے؟ کیا مسلمانوں کے معاملات میں ان کی گواہی قبول کی جاسکتی ہے؟ اسلامی ریاست کی بنیادیں کیا ہیں؟ اور اس پر کیا اعتراضات کیے جاتے ہیں؟ جہاد کیا ہے اور اس کے احکام کیا ہیں؟ ذمیوں کے کیا حقوق ہیں؟ اسلامی ریاست کے بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ غیر مسلموں سے عدم تعلق کی ہدایات کا صحیح پس منظر کیا ہے؟ یہ چند ایسے اہم مسائل ہیں جن کا جدید ذہن اطمینان بخش جواب چاہتا ہے۔

کتاب میں اس نوع کے تمام مباحث پر قرآن و حدیث کی روشنی میں اور مستند مفسرین، محدثین اور فقہاء کے حوالوں کے ساتھ عالمانہ اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے پس منظر میں اس کی خصوصی اہمیت ہے اور دعوت و تبلیغ کے میدان میں کام کرنے والوں کی بھی یہ ایک اہم ضرورت ہے۔

مصنف کی نظر ثانی کے بعد جدید ایڈیشن، آفسیٹ کی حسین طباعت، عمدہ کاغذ، خوب صورت جلد، صفحات: ۳۲۰، قیمت: ۱۸۵/- روپے

تحقیق وتنقید

حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات امن

ڈاکٹر تنویر قاسم

مسیحیت کا نقطۂ آغاز ہی امن کی تلاش ہے۔اس میں اخوت ومساوات، ہم دردی اور خدمت اور باہمی محبت و یگانگت پر زور دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہود کے ادنی طبقات اور یونان وروما کی کثیر تعداد عیسائیت میں داخل ہو کر روحانی تسکین حاصل کرنے میں سبقت لے گئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے پیروکاروں اور حواریوں کو تعلیم دی تھی کہ لوگ تمھیں اذیت سے ہم کنار کریں گے، لیکن تم ان پر صبر کرنا۔ یہی تمھارا اجر عظیم ہوگا۔

معاشرے میں عدم تشدد اور راست بازی کے ماحول کو قائم رکھنا اللہ کے محبوب بندوں کا شعار ہے اور انہی کے لیے 'خدا کی بادشاہت' ہے۔ حضرت عیسیٰؑ لوگوں کو توبہ اور محبت کی تلقین فرمایا کرتے تھے اور امن ومحبت کے معاملے میں دوست اور دشمن کے درمیان تمیز روا نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے تعصب اور نفرت کے رویوں سے اجتناب کرنے اور ستانے والوں کے ساتھ بھی احسان کرنے کی تلقین کی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ ہم اس لیے محبت کرتے ہیں کیوں کہ خدا نے پہلے ہم سے محبت کی۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے، میں خدا سے محبت کرتا ہوں، لیکن وہ اپنے عیسائی بھائیوں اور بہنوں سے نفرت کرتا ہے تو ایسا شخص جھوٹا ہے۔ وہ شخص، جو اپنے بھائی کو دیکھ سکتا ہے، پھر بھی اس سے نفرت کرتا ہے، اس خدا سے محبت نہیں کرسکتا جس کو وہ دیکھ نہیں سکتا۔ اس نے ہم کو یہ حکم دیا ہے:

''جو کوئی خدا سے محبت کرتا ہے اسے چاہئے کہ اپنے بھائی سے بھی محبت

رکھے۔'(یوحنا، ۲۱:۴)

انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن میں مسیحی تصورِامن کچھ یوں بیان کیا گیا ہے:

In the history of the church, peace has been on the one hand as calm for the soul and on the other hand as social and political reconciliation and the establishment of a just order. This had led to doctrines is a just war .... But more general statement speak of individual and communal well being.ا؎

کلیسا کی تاریخ میں امن ایک طرف روحانی سکون کا نام ہے اور دوسری طرف سیاسی، معاشرتی، ہم آہنگی اور قیام عدل کا نام بھی ہے اور اسی سے انصاف کی جنگ کا تصور بھی نکلا، لیکن اس کا عمومی مفہوم انفرادی اور اجتماعی بھلائی کا ہے۔

اناجیل میں تعلیماتِ امن

عیسائیت میں عہد نامہ جدید کی تعلیمات کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ امن کے بارے میں اناجیل کی درج ذیل تعلیمات ہیں۔ اس کا تعلق دنیا و آخرت دونوں سے ہے۔ سیدنا عیسیٰؑ نے فرمایا ہے:

”امن ہی میں تمہارے درمیان چھوڑے جا رہا ہوں اور امن ہی تمہیں دیتا ہوں۔ سو تم اپنے آپ کو خوف و ابتلا میں مت ڈالو“۔(یوحنا، ۲۷:۱۴)

نمک کی مثال دیتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

'نمک ایک بہترین چیز ہے، لیکن اگر نمک اپنے ذائقہ کو ضائع کر دے تو ”تم اس کو پھر دوبارہ نمک نہیں بنا سکتے۔ اسی وجہ سے تم اچھائی کا مجسم بنو اور ایک دوسرے کے ساتھ امن سے رہو“۔(یوحنا، ۲۷:۱۴)

''امن کی خدا کے ہاں سب سے زیادہ عظمت اور کرۂ ارض میں بسنے والے خندہ رو انسانوں کے ہاں سب سے زیادہ قدر و منزلت ہے۔ کیوں کہ خدا پریشانی نہیں، بلکہ امن لاتا ہے''۔ (کرنتھیوں، ۱۴: ۳۳)

امن کی عموماً تین سطحوں پر ضرورت ہوتی ہے:

۱۔ انفرادی سطح پر۔

۲۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ۔

۳۔ اقوام عالم کے مابین۔

انفرادی امن

قلبی اطمینان سے ہی انفرادی امن حاصل ہوتا ہے۔ جس معاشرہ میں ایسے افراد پائے جائیں جنھیں طمانینت قلبی حاصل ہو وہی پر امن معاشرہ کہلاتا ہے۔ طمانینت قلب کا مطلب ہے خدا کی چاہت اور اس کا تقرب، جس کے نتیجہ میں بندہ اس کا مطیع و فرماں بردار بن جاتا ہے اور اپنی ذات کو مکمل طور پر اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ عہدنامۂ جدید میں ہے:

''اور اسی کوشش میں رہو کہ روح کی یگانگی صلح کے بندسے بندھی رہے۔ ایک ہی بدن ہے اور ایک ہی روح۔ چنانچہ تمھیں جو بلائے گئے تھے اپنے بلائے جانے سے امید بھی ایک ہی ہے۔ ایک ہی خداوند ہے۔ ایک ہی ایمان۔ ایک ہی بپتسمہ۔ اور سب کا خدا اور باپ ایک ہی ہے، جو سب کے اوپر اور سب کے درمیان اور سب کے اندر ہے۔''
(افسیوں، ۴: ۳۔۶)

سیدنا عیسیٰؑ اپنی معاشرتی زندگی میں تمام تر وقت خدمتِ خلق میں گزارتے تھے۔ وہ بیماروں کا علاج اور ان کا تزکیہ کرتے تھے، حتیٰ کہ ان کے اردگرد ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اس کے باوجود وہ رات کو پہاڑوں پر نماز و ذکر کے لیے بھی جاتے تھے اور پوری پوری رات اسی عالم میں گزار دیا کرتے تھے۔

صلح پسندی

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ارشاد ہے:

''مبارک ہیں وہ لوگ جو صلح کراتے ہیں۔ وہ تو خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔'' (متی، ۵:۹)

قلب و ذہن کی طہارت اور تزکیہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انسان کے قلب و ذہن کے تزکیے پر بہت زور دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''کسی عورت کی جانب شہوت زدہ نظر سے دیکھنا ہی زنا کاری کے مترادف ہے۔'' (متی، ۵: ۲۸)

''ہمارے نادیدہ خیالات اور احساسات ترغیب دیتے ہیں۔ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے۔ دراصل ہماری شخصیت گری اور فطرت میں ہمارے افکار اور احساسات کا کردار بنیادی اور حتمی ہوتا ہے۔ لیکن روح ہمیں محبت، خوشی، اطمینان، تحمل، مہربانی، نیکی، ایمان داری، حلم اور پرہیزگاری وغیرہ سکھاتی ہے''۔ (گلتیوں، ۵:۲۲)

معاشرتی امن

انسانی تعلقات بہت سے اسباب سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں شوہر اور بیوی کے مابین خوش گوار ازدواجی تعلقات، اسی طرح ملازمین اور مالکوں کے مابین، اساتذہ اور طلبہ کے درمیان، امیر اور غریب کے درمیان خوش گوار تعلقات کی ضرورت ہے۔ خلاصہ یہ کہ امن معاشرتی سطح پر موجود تمام طبقات کے لیے ضروری ہے۔

معاشرے کے اندر عدم اطمینان اور بدامنی و بے سکونی کی اصل وجہ ہمارا گناہ کی طرف میلان ہے۔ انسانوں کے دل میں تکبر، کینہ و حسد اور خودغرضی جیسے سفلی جذبات پائے جاتے ہیں۔ جب ہم دوسروں کے احساسات کو ٹھیس پہنچاتے ہیں تو گویا ہم دشمنی

اور فساد کا بیج بو دیتے ہیں۔ اگر ہم اپنی انانیت دوسروں کی خاطر قربان کر دیں تو خاطر خواہ تبدیلی آ سکتی ہے اور ہماری حالت بدل سکتی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے موخر الذکر رویہ اپنانے کی ترغیب دی ہے۔ انھوں نے فرمایا:

> ''تو اب اے بھائیو اور بہنو! میں خدا حافظ کہتا ہوں۔ کامل ہونے کی کوشش کرو۔ میں نے جن باتوں کو کرنے کے لیے لکھا ہے اس پر عمل کرنے کی کوشش کرو۔ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر اور سلامتی سے رہو تو بے لوث محبت والا خدا اور اس کی سلامتی تم پر رہے گی''۔ (کرنتھیوں کے نام دوسرا خط، ۱۳:۱۱)
>
> ''تم ایک دوسرے کے ساتھ امن سے رہو، روح کے ذریعے امن سے رہو۔ تم سب مل کر اس اتحاد کو بچائے رکھو جو سلامتی سے حاصل ہوا ہے''۔ (افسیوں ۴:۳)

عیسائی تعلیمات کے مطابق معاشرہ کے افراد کے مابین امن وسکون کو رواج دینے کے لیے اصلاح کی از حد ضرورت ہے، لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم سب سے پہلے اپنی انفرادی اصلاح کریں، اللہ کے ساتھ اپنے تعلق میں پختگی لائیں اور اس کے لیے وہ راستہ اختیار کریں جس کا اللہ نے اپنے نبی سیدنا عیسیٰؑ کے ذریعے حکم دیا ہے۔

ربانی امن

اناجیل بڑی شدومد کے ساتھ اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں کہ امن کا بانی صرف خدا ہے اور کائنات میں اس وقت تک پائیدار امن قائم نہیں ہو سکتا جب تک ربانی امن کو اس دنیا میں فروغ نہ دیا جائے۔

جب سیدنا عیسیٰؑ یروشلم میں واقع اپنی جائے پیدائش بیت اللحم میں ہویدا ہوئے تب فرشتوں نے ان الفاظ کے ساتھ زمزمہ پردازی کی تھی کہ ''ہر اوجِ عظمت صرف خدائے برتر ہی کے لائق ہے اور امنِ ارضی ان لوگوں کے لیے ہے جس سے وہ راضی ہو جایے''۔ (متی، ۲:۱۔ ۲، لوقا، ۲:۱۱۔ ۱۴)

انجیل کا پیغام یہی ہے کہ وہ نظم وضبط کا خدا ہے نہ کہ انتشار وبدنظمی کا، جس

نے دنیا کی بدنظمی اور بے ضابطگی میں ایک ضابطے کی کارروائی کی، تاکہ اس دنیا کو اس کی اصل اور درست حالت میں لایا جاسکے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ہی اس نے جناب مسیحؑ کو مبعوث فرمایا، جنہوں نے خدائے برتر واعلیٰ کی بھرپور تائید و رضا کے ساتھ اپنا مشن پورا کر دکھایا۔ ایک جم غفیر انہیں خوش آمدید کہہ رہا تھا، جیسا کہ انجیل میں ہے:

''وہ پکار رہے تھے: خداوند کے نام پر آنے والے بادشاہ کے لیے خوش آمدید۔ آسمان میں امن و امان ہو اور خدا کے لیے جلال و عظمت ہو۔''
(لوقا، ۱۹: ۳۸)

آمدِ مسیح امن کی ضمانت

عہد نامہ جدید اس بات کا دعوے دار ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام ہی امن کی ضمانت ہیں:

''کیوں کہ مسیح کی وجہ سے ہم امن میں ہیں۔ مسیح نے ہم دونوں کو ایک کر دیا۔ یہودی اور غیر یہودی دونوں کو اس طرح علیٰحدہ کر دیا گیا تھا جیسے ان کے درمیان ایک دیوار ہو۔ وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے، لیکن مسیح نے اس دشمنی کو اپنا جسم دے کر دور کیا۔ یہودی شریعت میں کئی احکام ہیں، لیکن مسیح نے اس شریعت کو ختم کیا۔ مسیح کا مقصد یہ تھا کہ دونوں گروہوں کے لوگوں کو نئے انسان بنائیں۔ ایسا کر کے مسیح نے امن قائم کیا۔ مسیح نے آ کر تم غیر یہودی لوگوں کو امن کی تعلیم دی، جو خدا سے بہت دور تھے اور اس نے یہودیوں کو بھی، جو خدا کے نزدیک تھے، امن کی تعلیم دی۔'' (افسیوں، ۲: ۱۴، ۱۵، ۱۷)

رسولوں کے اعمال میں یہود کے لیے خوش خبری دی گئی ہے، جو امن سے مشروط ہے:

''خدا نے یہودیوں سے کہا ہے اور انہیں خوش خبری دی ہے کہ امن و امان یسوع مسیح سے ہی آتا ہے۔ یسوع ہی سب لوگوں کا خداوند ہے۔'' (اعمال ۱۰: ۳۶)

امن کے متعلق سیدنا مسیح علیہ السلام کے مزید ارشادات درج ذیل ہیں:

''جہاں تک تم سے ممکن ہو سکے، سب کے ساتھ امن سے رہو۔''
(رومیوں، ۱۲: ۱۸)

کرنتھیوں کے نام پولوس رسول اپنے پہلے خط میں سیدنا مسیح علیہ السلام کو پوری دنیا کے لیے 'امن کی آشا' قرار دیتا ہے:

''میرا مطلب ہے، خدا نے مسیح میں ہو کر دنیا اور اپنے درمیان امن قائم کر لیا۔ خدا نے لوگوں کو مسیح میں ان کے گناہ کے لیے قصور وار نہیں ٹھہرایا اور اس نے امن کے اس پیغام کو ہمیں لوگوں کو سنانے کے لیے دیا۔'' (لوقا، ۱۴: ۳۲)

مسیحی امن فارمولہ

مسیحیت میں امن مشروط ہے۔ امن کی تعلیمات بلا قید نہیں ہیں۔ امن انہی کے لیے ہے جو باایمان (مسیحی) اور امن کے خواست گار ہوں۔ ایسے لوگ، جو ایمان سے عاری (غیر مسیحی) ہوں اور مسیحی معاشرہ سے جدائی کے طلب گار ہوں، ان کے لیے امن کا فارمولا درج ذیل ہے:

''اگر ویسے مرد جو باایمان نہ ہو اور جدا ہونا چاہے تو اسے ہو جانے دو۔ ان حالات میں کوئی بھائی یا بہن پابند نہیں۔ خدا نے ہم کو پر امن زندگی کے لیے بلایا ہے۔'' (کرنتھیوں اول، ۷: ۱۵)

عہدنامہ قدیم میں جس طرح دشمنوں کو نیست و نابود کرنے اور ان کا قتل کرنے کے واضح احکام موجود ہیں، اس طرح کے احکام عہدنامہ جدید میں نہیں ملتے۔ اس میں امن کا پیغام نمایاں ہے۔ معاشرتی انصاف کی جا بہ بجا تلقین کی گئی ہے:

''اور اپنے پیروں میں امن کی خوش خبری کی نعلین پہن لو، جو تمہیں طاقت سے کھڑے رہنے میں مدد دے گی''۔ (افسیوں، ۶: ۱۵)

''تم سب امن اور سلامتی کی زندگی میں رہ کر اس کا اعزاز سمجھو اور اپنے کام کی طرف توجہ دو اور اپنی کمائی اپنے ہاتھ سے کماؤ، ہم تمہیں سب

کرنے کے لیے پہلے ہی کہہ چکے ہیں“ ۔(تھسلنیکیوں اول، ۴: ۱۱)
”اور ان کے کام کے سبب سے محبت کے ساتھ ان کی بڑی عزت کرو اور ایک دوسرے کے ساتھ امن سے رہو“ ۔(تھسلکیوں اول، ۵: ۱۳)
”تم میرے سچے فرزند کی مانند ہو، کیوں کہ تم ایمان رکھتے ہو، فضل وکرم، امن وامان اور سلامتی خدا باپ اور ہمارے خداوند یسوع مسیح کی طرف سے تم پر نازل ہوتا رہے“ ۔ (تیمتھیس اول، ۱: ۲)
’اس کو بہت زیادہ مے نہیں پینا چاہیئے اور اسے لوگوں سے لڑنے والا نہیں ہونا چاہیئے، اس کو نرم مزاج اور پر امن ہونا چاہیئے ۔ وہ ایسا نہیں ہو جو پیسہ سے پیار کرتا ہو“ ۔(تیمتھیس اول، ۳: ۳)
”جب ہمیں سزا دی گئی تو ہم لوگوں نے خوشی نہیں منائی، بلکہ سزا پانا تو درد سے بھرا ہوا تھا، لیکن سزا پانے کے بعد ہم لوگوں نے سزا سے سبق سیکھا۔ ہم لوگ امن و امان میں ہیں، کیوں کہ ہم لوگوں نے سیدھی زندگی گزارنی شروع کردی ہے“ ۔(عبرانیوں، ۱۱: ۱۲)
”لیکن جو حکمت اوپر سے آتی ہے، پہلے یہ پاک ہے، پھر پر امن ۔ نرم اور وسیع ذہن آسانی سے قبول کرنے والی نئی سچائی، یہ رحم سے بھرپور نیک عمل کرنے اور دوسروں کے ساتھ ایمان دار اور غیر جانب دار رہتی ہے ۔ جو لوگ امن کے لیے پرامن طریقے سے کام کرتے ہیں وہ راست بازی کے ذریعہ اچھی چیزوں کو پاتے ہیں“ ۔(یعقوب، ۳: ۱۷۔ ۱۸)

تشکیل امن

تشکیلِ امن کے دائرے میں آزادی، تحفظ و بقا، فلاح و بہبود، عظمت و رفعت اور سیاسی استحکام وغیرہ سب شامل ہے ۔ جو شخص بھی ان چیزوں کے لیے کوشاں ہوگا اسے بجا طور پر امن کا علم بردار کہا جائے گا ۔ انجیل متی عیسائیت کے بنیادی اصول وضوابط کے تناظر میں سیدنا عیسیٰؑ کے ’پہاڑی کے وعظ‘ کے حوالے سے یہ روایت کرتی ہے کہ ” امن کی تشکیل کے لیے کوشاں لوگ قابل ستائش ہیں ۔ انہیں اس کے بدلے

میں 'خدا کے بیٹوں' کے لقب سے پکارا جائے گا''۔ (متی، ۵:۹)

ہم سایوں سے محبت

حضرت عیسیٰؑ نے ہم سایو ں سے محبت کا درس دیا۔ ان کے نزدیک ہم سایے سے مراد صرف وہ شخص نہیں ہے، جس سے کوئی رشتہ داری ہو، بلکہ ہر وہ شخص ہے جو کسی بھی طرح کے رابطے میں آئے۔ انھوں نے فرمایا:

''اپنے والدین کی عزت کرو اور تمھیں اپنے ہم سائے سے محبت کرنی چاہیے''۔ (متی، ۱۹:۱۹)

اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا:

''تم اپنے ہم سائے سے اسی طرح محبت کرو جس طرح اپنے آپ سے محبت کرتے ہو''۔ (متی، ۲۲:۳۹)

لوقا کی انجیل میں اسی بات کو بہت زور دے کر کہا گیا ہے:

''لیکن آدمی نے بتانا چاہا کہ وہ اس کا سوال پوچھنے میں سیدھا ہے۔ اس لیے اس نے یسوع سے پوچھا کہ میرا پڑوسی کون ہے؟ تب یسوع نے کہا: ایک آدمی یروشلم سے یریحو کے راستہ میں جا رہا تھا کہ چند ڈاکوں نے اسے گھیر لیا۔ اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے اور اس کو بہت زیادہ پیٹا بھی۔ اس کی یہ حالت ہوئی کہ وہ نیم مردہ ہو گیا۔ وہ ڈاکو اس کو وہاں چھوڑ کر چلے گئے۔ ایسا ہوا کہ ایک یہودی کاہن اس راہ سے گزر رہا تھا۔ وہ کاہن اس آدمی کو دیکھنے کے باوجود اس کی کسی بھی قسم کی مدد کیے بغیر اپنے سفر پر آگے روانہ ہوا۔ تب لاوی اسی راہ پر سے گزرتے ہوئے اس کے قریب آیا۔ وہ بھی اس زخمی آدمی کی کچھ بغیر مدد کیے اپنے سفر پر آگے بڑھ گیا۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک سامری، جو اس راستے پر سفر کرتے ہوئے اس جگہ پر آیا، وہ راہ پر پڑے ہوئے زخمی آدمی کو دیکھتے ہوئے بہت دکھی ہوا۔ سامری نے اس کے قریب جا کر اس کے زخموں پر زیتون کا تیل اور مے لگا کر کپڑے سے باندھ دیا۔

وہ سامری چوں کہ ایک گدھے پر سواری کرتے ہوئے بذریعے سفر وہاں پہنچا تھا، اس نے زخمی آدمی کو اپنے گدھے پر بٹھایا اور اس کو ایک سرائے میں لے گیا اور اس کا علاج کیا۔ دوسرے دن اس سامری نے دو چاندی کے سکے لیے اور اس کو سرائے والے کو دے کر کہا کہ اس زخمی آدمی کی دیکھ بھال کرنا۔ اگر کچھ مزید اخراجات ہوں تو پھر جب میں دوبارہ آؤں گا تو تجھ کو ادا کروں گا۔ یسوع نے پوچھا کہ ان تینوں آدمیوں میں سے کس نے ڈاکو کے ہاتھ میں پڑے آدمی کا پڑوسی ہونا ثابت کیا ہے؟'۔(لوقا،۱۰:۲۹۔۳۶)

گویا اہم بات کسی شخص کا ہم سایہ ہونا ہے، نہ کہ اس کی قومیت یا مذہب۔ دوسرا کردار اس کہانی میں ایک پادری کا تھا جو اس یہودی کے پاس سے حقارت سے گزر گیا۔ تیسرا کردار ایک مربی کا ہے، جس نے ایک آدمی کو یوں پڑا دیکھا اور گزر گیا۔ چوتھا کردار ایک سامری کا ہے، جو کہ یہودی مذہب کے نزدیک ملحد تھا۔ اس نے انسانی ہم دردی اور بھائی چارے کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس مرتے ہوئے یہودی کی مدد کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اس زخمی اور خستہ حال یہودی کی مرہم پٹی کی، پھر اس کو اپنے گھوڑے پر سوار کیا اور ایک سرائے میں لے جا کر اس کی مزید مدد کی۔ اس واقعہ میں سیدنا عیسیٰؑ نے یہ پیغام دیا ہے کہ ہم سایہ محض وہ شخص نہیں ہوتا جو آپ کے برابر میں رہتا ہے، یا جس کا تعلق آپ کے قبیلے اور ملک سے ہوتا ہے، بلکہ ہم سایہ ہر وہ شخص ہے جو آپ کے ساتھ بغیر مذہبی، نسلی اور اخلاقی تعلق کے بھی وابستہ ہو چکا ہے۔ صاحب تفسیر الکتاب لکھتے ہیں:

''سامری نے سارے انسانوں کا احترام کرنا سیکھا تھا، اس لیے وہ اس پر ترس کھاتا ہے جس طرح وہ چاہتا ہے کہ ایسی حالت میں مجھ پر ترس کھایا جائے۔ اس سامری کا ترس کوئی بے عمل ترس نہ تھا۔ اس نے صرف اپنا دل ہی نہیں بڑھایا، بلکہ اس بے کس زخمی آدمی کی مدد کے لیے اپنا ہاتھ بھی بڑھایا۔ دیکھئے کہ یہ سامری کیسا ہم درد ہے۔ وہ زخمی آدمی کے پاس آیا۔

کاہن اور لاوی اس سے دور دور رہے تھے۔ اس وقت کوئی ڈاکٹر کوئی جراح نہیں مل سکتا تھا، اس لیے اس سامری نے خود یہ کام کیا۔" ۲؎

سیدنا عیسیٰؑ نے جس دور میں ہم سایوں کے ساتھ محبت کرنے کا درس دیا، اس دور میں پادریوں کے نزدیک ہم سایہ صرف خونی رشتے والے شخص کو سمجھا جاتا تھا۔ انھوں نے اس کا وسیع تصور پیش کیا اور اس کا مطلب یہ بتایا کہ اس کی آڑے وقت میں امداد کی جائے، اس کی ضروریات پوری کی جائیں، اس کی کوتاہیوں سے درگزر کیا جائے، اس کا دکھ درد بانٹا جائے اور اس کا بوجھ ہلکا کیا جائے۔ یہ خدمت کا ایک ایسا انداز اور رویہ ہے، جو اپنے اندر بہت اثر رکھتا ہے۔

دشمنوں سے محبت

حضرت عیسیٰؑ نے دشمنوں سے بھی محبت کرنے کا سبق دیا ہے۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک جب تک ہم حقیقی طور پر اپنے دشمنوں کے ساتھ محبت کرنا نہیں سیکھ لیتے، تب تک کرۂ ارض فساد کا منظر پیش کرتی رہے گی۔ لوقا کی انجیل میں ہے:

"اگر تم اپنے محبت رکھنے والوں ہی سے محبت رکھو تو تمہارا کیا احسان ہے؟ کیوں کہ گنہ گار بھی اپنے محبت رکھنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔ اور اگر تم ان ہی کا بھلا کرو جو تمہارا بھلا کریں تو تمہارا کیا احسان ہے؟ کیوں کہ گنہ گار بھی ایسا ہی کرتے ہیں اور اگر تم ان ہی کو قرض دو جن سے وصول ہونے کی امید رکھتے ہو تو تمہارا کیا احسان ہے؟ گنہ گار بھی گنہ گاروں کو قرض دیتے ہیں، تا کہ پورا وصول کر لیں۔ مگر تم اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور بھلا کرو اور بغیر ناامید ہوئے قرض دو تو تمہارا اجر بڑا ہوگا اور تم خدا تعالیٰ کے بیٹے ٹھہرو گے، کیوں کہ وہ ناشکروں اور بدوں پر بھی مہربان ہے۔ جیسا تمہارا باپ رحیم ہے، تم بھی رحم دل ہو۔"
(لوقا، ۶: ۳۲_۳۶)

آپؑ کے پہاڑی کے وعظ میں بہت سے بنیادی اور سماجی ضوابط موجود

تھے۔ ان میں سے چند مشہور اقوال درج ذیل ہیں:

''لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ تم کسی پر غصّہ نہ کرو۔ ہر ایک تمہارا بھائی ہے۔ اگر تم دوسروں پر غصہ کرو گے تو تمہارا فیصلہ ہوگا اور اگر تم کسی کو برا کہو گے تو تم سے یہودیوں کی عدالت میں چارہ جوئی ہوگی۔ اگر تم کسی کو نادان یا اُجڈ کے نام سے پکارو گے تو دوزخ کی آگ کے مستحق ہو گے... زنا نہ کرو..... کسی کو ہلاک نہ کرو— اگر تم زنا نہیں کرتے ہو، لیکن کسی کو ہلاک کرتے ہو، تب تم خدا کی شریعت کو توڑنے والے ٹھہرے۔'' (یعقوب، ۲: ۱۱)

ایک اور خطبے میں سیدنا عیسیٰؑ ارشاد فرماتے ہیں:

''میں تمہیں جو کہتا ہوں اسے خوب اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ تم اپنے دشمنوں سے پیار کرو۔ جس نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور جو تمہیں گزند پہنچاتا ہے تم اس کے لیے دعا کرو''۔ (متی، ۵: ۴۴)

ایک جگہ یوں حکم ہوا ہے:

''بلکہ تم اپنے دشمنوں کے ساتھ محبت کرو اور ان کو بغیر واپسی کی امید کے قرض دے دو''۔ (لوقا، ۶: ۳۵)

اس حکم نامے میں سیدنا مسیحؑ نے یہ وضاحت فرما دی ہے کہ حقیقی محبت کرنے والا بغیر کسی امید کے محبت کرتا ہے۔ ہم طبعی طور پر سچے پیار کو جانتے ہیں۔ اگر ہم اس کو پاسکیں تو ہم اسے خدا سے حاصل کر سکتے ہیں، اپنے والدین سے اور اپنے انتہائی قریبی دوست سے بھی۔ اگرچہ یہ مسلسل نہیں ہوتا، مگر ہمیں اس کا تجربہ ضرور ہوجاتا ہے اور ہمیں اس بات کی چنداں حاجت نہیں رہ جاتی کہ ہم سچے پیار اور جھوٹے پیار میں فرق بتائیں، جو محبت ہی کے نام پر کیا جاتا ہے، مگر بغیر کسی روحانی و مسیحائی محرک کے۔ عملی محبت ہی ہے جو مسیحؑ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے دشمنوں کے ساتھ کریں۔ یہی ایک اصول ہے جس کے ذریعے ہم ربانی محبت اور پیغام کو اپنے دشمنوں سے اچھے برتاؤ کے ساتھ عام کر سکتے ہیں۔

عفو و درگزر

انجیل اس بات پر بہت زور دیتی ہے کہ دوسرے انسانوں کی کوتاہیوں سے درگزر کیا جائے۔ اگر چہ معافی کوئی آسان بات نہیں ہے، کیوں کہ کسی کی زیادتی کو محض ایک لفظ 'معافی' سے نہیں بھلایا جا سکتا، چنانچہ دوسروں کو معاف کر دینا بڑا ہی بلند ہمت کام ہے۔ ہمیں ضرور عفو و درگزر سے ایسے معاملات کو حل کرنا سیکھنا ہوگا۔ انجیل میں اس سلسلے کی صریح تعلیمات ملتی ہیں:

''اور جس طرح ہم نے اپنے قرض داروں کو معاف کیا ہے تو بھی ہمارے قرض ہمیں معاف کر...اور ہمارے گناہ معاف کر، کیوں کہ ہم بھی اپنے قرض دار کو معاف کرتے ہیں اور ہمیں آزمائش میں نہ لا''۔ (متی، ۶: ۱۲، لوقا، ۱۱: ۴)

''اگر تم دوسرے لوگوں کی کوتاہیاں معاف کر دو گے تو تمہارا آسمانی باپ بھی تمہاری غلطیاں معاف فرما دے گا۔ لیکن اگر تم لوگوں کی غلطیاں معاف نہیں کرو گے تو تمہارا آسمانی باپ بھی تمہاری خطائیں معاف نہیں کرے گا''۔ (متی، ۶: ۱۴۔۱۵)

''تب پطرس اوپر آیا اور اپنے آقا سے کہا !اگر میرا بھائی میرے خلاف برائی کرے تو میں کتنی مرتبہ اسے معاف کروں؟ کیا اسے سات دفعہ معاف کر دوں؟ تب مسیح نے اسے جواب دیا: بلکہ تو اسے ستر بار معاف کر دے۔ میں تمہیں سات دفعہ نہیں، بلکہ ستر دفعہ معاف کرنے کا حکم دیتا ہوں''۔ (لوقا، ۱۷: ۴)

''اور ایک دوسرے پر مہربان اور نرم دل ہو اور جس طرح خدا نے مسیح میں تمہارے قصور معاف کیے ہیں، تم بھی ایک دوسرے کے قصور معاف کرو''۔ (افسیوں، ۴: ۳۲)

''پس جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں وہی تم بھی ان کے ساتھ کرو، کیوں کہ توریت اور نبیوں کی تعلیم یہی ہے''۔ (متی، ۷: ۱۲)

''اگر تیرا بھائی تیرا گناہ کرے تو جا اور خلوت میں بات چیت کر کے اسے سمجھا۔ اگر وہ تیری سنے تو تُو نے اپنے بھائی کو پا لیا۔ اور اگر نہ سُنے تو ایک دو آدمیوں کو اپنے ساتھ لے جا، تا کہ ہر ایک بات دو تین گواہوں کی زبان سے ثابت ہو جائے۔ اگر وہ ان کی سننے سے بھی انکار کرے تو کلیسیا سے کہہ اور اگر کلیسیا کی سننے سے بھی انکار کر تو تُو اسے غیر قوم والے اور محصول لینے والے کے برابر جان۔۔۔ خبردار رہو! اگر تیرا بھائی گناہ کرے تو اسے ملامت کر۔ اگر توبہ کرے تو اسے معاف کر۔ اور اگر وہ ایک دن میں سات دفعہ تیرا گناہ کرے اور ساتوں دفعہ تیرے پاس پھر آ کر کہے کہ توبہ کرتا ہوں تو اسے معاف کر''۔ (متی، ۱۸:۲۱)

مزاحمت اور تشدد سے اجتناب

عیسائیت پر عمل کرنے والے کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ انجیل جناب عیسیٰؑ کی سیرت اور خدمتِ انسانیت کا پرتو ہے کہ آپ کی ساری زندگی تشدد اور مزاحمت سے پاک تھی۔ عیسائیت کی پہلی صدی عدم تشدد کی واضح مثال ہے، جس کی بنیاد دراصل سیدنا عیسیٰؑ کی تشدد سے پاک ان تعلیمات پر تھی:

''میں تمہیں تمہارے دشمنوں کے ساتھ محبت کا سلوک کرنے کی تلقین کرتا ہوں اور ان کے لیے دعا کرنے کو کہتا ہوں جو تمہیں کوئی تکلیف دیتا ہے''۔ (متی، ۵: ۴۴)

انجیل متقاضی ہے اس بات کی کہ ہر عیسائی کو امن کا علم بردار ہونا چاہئے۔ اسے دنیا میں امن کے دیرپا قیام کی کوششوں سے بخوبی آگاہ ہونا چاہئے اور اس کی تشکیل کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا چاہئے۔ سیدنا مسیحؑ کی تعلیمات کے مطابق ایسا رویہ اختیار کر کے ہی کوئی سچا مسیحی بن سکتا ہے۔

امن پسندی

مسیحیوں میں 'امن پسند' تحریک ابتداء ہی سے بہت مقبول رہی ہے۔ یہ

ایک عیسائی کو جنگ میں شرکت سے روکتی ہے۔ ابتدائی دور کے رومن حکم رانوں کے ہاں عیسائی سپاہیوں کے شواہد بالکل نہیں ملتے۔ چرچ عیسائیوں کو جنگ وجدل سے روکتا ہے اور اس قسم کی سرگرمیوں سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ ابتدائی عیسائی ادب میں بھی اس قسم کی سرگرمیوں کے بارے میں کوئی تحریر نہیں ملتی۔ مسیحی تعلیمات، جیسے ''دشمن سے محبت کریں''، 'کسی کو قتل نہ کریں' اور 'اگر کوئی ایک طمانچہ مارے تو اپنا دوسرا گال اسے پیش کر دیں'' اس تحریک کے ابتدائی حوالے ہیں۔ ایک بڑی مثال یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی گرفتاری کے وقت اپنے ساتھی پطرس اور باقی حواریوں سے اپنے دفاع کے لیے مدد نہیں مانگی۔

دوسری صدی کی دستاویزات، جو اسکندریہ کے چرچ سے لی گئی ہیں، Apostalic Tradition کے نام سے موسوم ہیں، وہ امن پسند تحریک کی وکالت کے لیے بہت مشہور ہیں۔ ان میں یہ حکم ملتا ہے کہ جس شخص کے ہاتھ میں تلوار ہے، اسے چاہیے کہ وہ پھینک دے اور جو سپہ گری کا پیشہ اختیار کرتا ہے وہ خدا سے دور ہو جاتا ہے۔ اس کا خدا سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ چوتھی صدی تک اس طرح کی تعلیمات عیسائیوں میں غالب رہی ہیں'' کہ میں سپاہی نہیں بنوں گا۔ میں گناہ کا ارتکاب نہیں کرنا چاہتا، کیوں کہ میں ایک عیسائی ہوں۔''۔ مسیحی تاریخ میں 'سینٹ ماریین' کو عیسائیت قبول کرنے کے بعد سپہ گری چھوڑنے پر قتل کر دیا گیا تھا۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں عصر حاضر میں بھی ملتی ہیں۔ ۳؎

خدمتِ انسانیت

انجیل مقدس میں جا بہ جا اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ سیدنا عیسیٰؑ نے کیا عمل کر کے دکھایا۔ ان کے معجزاتِ مسیحائی، ان کا دوسروں کی مدد کے لیے بھاگ دوڑ کرنا، غریبوں کی دل جوئی کرنا، عاجزی وانکساری، خلوص ومسکنت اور ستائش سے بے نیاز ہو کر خدمتِ انسانیت، یہ تمام چیزیں مشعلِ راہ ہیں۔ انجیل کی مندرجہ ذیل

آیات میں خدمتِ انسانیت پر بہت زور دیا گیا ہے:

''بلاشبہ انسان دوسروں کی خدمت کے لیے بھیجا گیا تھا، نہ کہ اس لیے کہ دوسرے اس کی خدمت کریں۔ تم میں سے عظیم وہ ہیں جو تمہاری خدمت کرتے ہیں۔ جو خود کو بلند کرنے کی کوشش کرے گا وہ پست کر دیا جائے گا اور جو اپنے آپ کو پست رکھے گا اسے بلند کر دیا جائے گا۔ خداوند کے سامنے اپنے آپ کو عاجز بنو، پھر وہ تمہیں سربلند کرے گا''۔ (یعقوب، ۴:۱۰)

''سب سے بہترین تم غریب لوگ ہو، خدائی سلطنت تمہاری ہے۔ سب سے بہترین تم بھوکے لوگ ہو، تمہیں ضرور کھلایا جائے گا۔ سب سے بہترین تم رونے والے لوگ ہو، تمہیں ضرور ہنسایا جائے گا''۔ (لوقا، ۶:۲۰۔۲۱)

''تمہارا خدا ہم سب کا معلم ہے۔ اس نے اور میں نے تمہارے پاؤں دھوئے ہیں تو تمہیں بھی چاہئے کہ تم دوسروں کے پاؤں دھو دو۔ سو میں تمہیں اپنی مثال دے چکا ہوں۔ تمہیں چاہئے کہ تم بھی اب وہی کرو جو میں نے تمہیں کر دکھایا ہے''۔ (یوحنا، ۱۳: ۱۴)

جناب مسیح نے اپنا بیش تر وقت نادار لوگوں کی مدد کرنے میں گزارا۔ انہوں نے ان لوگوں کی مسیحائی کی جو بیمار تھے۔ انھوں نے اکثر گناہ گاروں اور بھتہ خوروں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا، جن کو معاشرے میں بہت برا سمجھا جاتا تھا۔

سیدنا مسیح کی تعلیمات کی پیروی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے نقش قدم پر چلا جائے، غریبوں کی امداد کی جائے، محبت والے کام کیے جائیں، مصیبت زدہ اور روتی بلکتی انسانیت کی مدد کی جائے۔ کسی غریب کو حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے، کسی جاہل سے نفرت نہ کی جائے، معذور اور ضرورت مند انسانوں کی ہر ممکن طریقے مدد کی جائے۔

قانون کا احترام

سیدنا عیسیٰؑ سے پوچھا گیا کہ کیا ہم قیصر روم کو ٹیکس ادا کریں؟ سیدنا عیسیٰؑ نے

جواب دیا: ''جو کچھ قیصر کا حصہ ہے وہ قیصر کو دیا جائے اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دیا جایئے''۔ (متی، ۲۲:۱۷)

ایک مملکت کا اپنے شہریوں پر یقینی استحقاق ہوسکتا ہے۔ یہاں قیصر سے مراد وہ قوانین ہیں جو حکومت بناتی ہے۔ شہریوں کا فرض ہے کہ وہ ان قوانین کا احترام کریں۔ ٹیکس ادا کرنا اس کی ایک مثال ہے۔ ایک حکومت اپنے شہریوں کو مختلف سہولیات مہیا کرتی ہے، چنانچہ شہریوں کو چاہئے کہ وہ اس کے بدلے میں ٹیکس ادا کریں۔

البتہ بعض اوقات حالات کی مناسبت سے کچھ حدود و قیود ہوسکتی ہیں، جن میں رہ کر ایک حکومت اپنے شہریوں سے مطالبہ کرسکتی ہے۔ اسی طرح ''خدا کو دو'' دراصل اس بات کی وضاحت ہے کہ حکومت کی اطاعت کس حد تک کرنی ہوگی؟ کیوں کہ کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کا تعلق صرف خدا سے ہوتا ہے، جب کہ حقیقی بادشاہت صرف اسی کی ہے۔ سب سے اعلیٰ وفاداری صرف خدا کے ساتھ کی جائے، یہی عیسائیت کا درس ہے۔

تعلیماتِ مسیح سے عیسائیوں کا انحراف

حضرت عیسیٰؑ کی سادہ، پرامن اور فطری تعلیمات بلا شک وشبہ اسی وقت تک محفوظ رہیں جب تک سینٹ پال نے مسیحیت قبول نہ کرلی۔ ان سادہ تعلیمات میں اس قدر وضاحت نہ تھی جس کی روشنی میں زندگی کے اہم مسائل سلجھائے جاسکتے۔ سینٹ پال کی جاہلی خرافات اور لغویات کی آمیزش نے مسیحیت کے سچے پیغام کی وہ خوف ناک تشریح کی جس سے بالآخر مسیحیت چند بے جان مراسم اور بے کیف عقائد کا نام ہی رہ گئی۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی مشہور تصنیف 'انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر' میں لکھا ہے:

> 'چھٹی صدی میں مسیحیت کے احوال میں مشہور زمانہ عیسائی مورخ اور مترجم قرآن 'سیل' لکھتا ہے کہ مسیحیوں نے بزرگوں اور مسیح کے

مجسموں کی پرستش میں اس حدتک غلو کیا کہ رومن کیتھولک عیسائی بھی ایسا نہ کرپائے تھے۔ اسی غلو کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر نفس مذہب اور حکومتی مباحث ایسے ابھرے کہ بے نتیجہ اختلافات کی شورش نے پوری قوم کو الجھا کر اس طرح رکھ دیا کہ اس کا انجام بڑے خوں ریز جنگی معرکوں کی شکل میں سامنے آیا۔ مخالفین مذہب کو سزائیں اس حدتک دی گئیں کہ اس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ متضاد مذہب کے پیروکا رقیرس (cyrus) کی نیابتِ مصر کے دس سال کی تاریخ وحشیانہ سزاؤں اور لرزہ خیز مظالم کی داستانوں سے لبریز ہے'' ۴۔

ایک مشہور مسیحی مصنف رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے:

''پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ پر گہری تاریکی چھائی رہی، جو کہ تدریجاً زیادہ گہری اور بھیانک ہوتی چلی جارہی تھی۔ اس دور کی وحشت و بربریت زمانہ قدیم کی وحشت و بربریت سے کئی درجہ زیادہ بڑھی ہوئی تھی، کیوں کہ اس کی مثال ایک بڑے تمدن کی لاش کی تھی جس کے نشانات مٹ رہے تھے اور جس پر زوال کی مہر لگ چکی تھی۔ وہ مما لک، جہاں پر تمدن برگ و بار لایا تھا اور گزشتہ زمانہ میں اپنی ترقی کو پہنچ چکا تھا، جیسے اٹلی، فرانس، مگر اب وہاں طوائف الملوکی اور ویرانی کا دور دورہ تھا۔ ۵۔

امن کا یہ قتل اور مسیحی تعلیمات کی کھلی تحریف عیسائیت کے لیے ایک بدنما داغ بن گئی۔

حواشی و مراجع

۱۔ The Encyclopedia of Religion, 17,222

۲۔ میتھیو ہینری کامنٹری تفسیرالکتاب ۳/ ۷ ۵۳، چرچ فاؤنڈیشن سیمینار، لاہور، ۲۰۰۵ء

3- christan perspectlive, P. 9Jacques E L, Vollence: Reflections from

۴۔ ابوالحسن علی ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر۔ مجلس نشریات اسلام کراچی، ص 42، 43

۵۔ Brefault, Robert .The Making of Humanity .P 164

مصر میں آزادیِ نسواں کی تحریک

اور اس کے اثرات

ڈاکٹر جاں نثار معین

خواتین کی حیثیت کا تاریخی جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے حقوق سے محروم رہی ہیں۔ ان کے وجود کو اکثر تسلیم نہیں کیا گیا۔ کہیں ان کے انسان ہونے پر ہی سوالیہ نشان لگا دیا گیا۔ اس ضمن میں جرمن مصنف ہیڈوِنگ ڈوم Hedwing Dohm نے لکھا ہے: خواتین کی تاریخ درحقیقت ان کی حوصلہ شکنی اور عدم انصاف کی تاریخ ہے۔ یہ تاریخ کہتی ہے کہ مردوں نے تمام شعبہ ہائے زندگی میں خواتین کا استحصال کیا ہے''۔ اگر کبھی انہیں انسان تسلیم کر بھی لیا گیا تو ایسا مردوں نے اپنے مفاد کی خاطر کیا۔

آزادیِ نسواں اصلاً مغربی اصطلاح ہے۔ تحریکِ آزادی نسواں بھی وہیں کی دین ہے۔ اس کا نقطہ آغاز فرانسیسی ماہر قانون خاتون C hristine de Pizan (۱۳۶۵۔۱۴۳۰) کے خیالات کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس نے اپنی تحریروں میں عورتوں کی حالتِ زار پر تفصیل سے لکھا ہے۔ اس نے ایک جگہ ان الفاظ میں اظہارِ خیال کیا ہے:

> ''جب میں عورتوں کی حیثیت کے بارے میں سوچتی تھی تو میرا دل غم و اندوہ سے لبریز ہوجاتا تھا۔ یہ مجھے، بلکہ پورے طبقۂ نسواں کو بدمزہ کرتا تھا۔ ایسا لگتا، گویا ہم کائنات میں ننگِ انسانیت مخلوق ہیں... جب میرے ذہن میں مذکورہ خیالات آتے تو میرا سر شرم سے جھک

جاتا، آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوجاتیں اور میں اپنی کرسی میں گڑ جاتی''۔۲؎

Pizan نے خواتین کی قدر و قیمت کو آشکار کیا۔ اسی لیے اس نے اپنی تحریروں میں کام یاب خواتین کی مثالیں پیش کی ہیں۔ اس طرح اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ خواتین کسی بھی کام میں مردوں سے کم تر نہیں۔ ان کی پس ماندگی دراصل تعلیم و تربیت سے محرومی کی وجہ سے ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو بھی تمام سہولتیں حاصل ہوں تو وہ کسی بھی میدان میں لڑکوں سے کم نہیں ہوں گی۔ اس کے ان نظریات نے صدیوں سے چلی آ رہی فرسودہ روایت کو ختم کر دیا۔ اگلی تمام تحریکاتِ نسواں اس خاتون کے نظریات کے ساتھ اٹھارویں صدی تک جگہ جگہ مختلف صورتوں میں سرگرم رہیں۔ ان تحریکات کو Equal Rights Movements کا نام دیا گیا۔

یورپ میں نشاۃِ ثانیہ کے نتیجے میں مختلف میدانوں میں انقلاب آیا تو خواتین کی حالت میں بھی مثبت تبدیلیاں آنے لگیں۔ اس کوشش کو آزادی نسواں یا تحریکِ نسواں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کے تحت خواتین مردوں کے شانہ بہ شانہ کھڑی ہوگئیں، صنفی مساوات کے نعرے بلند ہوئے۔ اس طرح یہ تحریک تمام یورپی ممالک میں تیزی سے پھیل گئی۔ اس معاملے میں فرانس سب سے آگے تھا۔

مصر میں تصورِ آزادیِ نسواں

مصر میں آزادیِ نسواں کی تحریک کا آغاز اس وقت ہوا جب اہل مصر کا فرانسیسیوں سے راست طور پر رابطہ ہوا۔ مصر سے متعدد تعلیمی وفود فرانس گئے۔ وہاں انہوں نے نہ صرف اعلیٰ تعلیم اور فنی مہارت حاصل کی، بلکہ فکری اعتبار سے بھی کسبِ فیض کیا اور سیاسی و معاشرتی افکار اپنے ساتھ مصر لائے۔ اسی زمانے میں پورے یورپ میں آزادی نسواں کی تحریکیں زور و شور سے کام کر رہی تھیں۔ فرانس میں یہ تحریک شباب پر تھی۔

مصر میں آزادیِ نسواں کے نتیجے میں خواتین کے لیے مردوں کے مساوی حقوق کا مطالبہ کیا گیا۔ یہ رجحان عالم اسلام کے دیگر ممالک کی طرح مصر میں بھی تیزی سے ابھر رہا تھا۔ اس عہد میں علمی اور معاشرتی میدانوں میں خاص طور پر خواتین کے حقوق پامال تھے۔ لڑکیوں کے لیے تعلیمی ادارے نہ تھے، جب کہ لڑکوں کے لیے بہت سے ادارے موجود تھے۔ اس وقت یہ تصور عام تھا کہ لڑکیاں علم حاصل کرلیں گی تو اس کا غلط استعمال کریں گی۔ اسی لیے انہیں صرف گھریلو ہنر، سلائی، کڑھائی اور مردوں کی خدمت کے کام سکھائے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں محمد حسین ہیکل نے لکھا ہے:

> ”عورتوں کی تعلیم اس زمانے میں ایک انہونی چیز تھی۔ کوئی شخص، جو کہ جمہور کی رائے کا احترام کرتا ہو، لڑکیوں کو تعلیم نہیں دلا سکتا تھا۔ جہاں تک پردے کے عدم التزام اور عورت کے بے پردہ نکلنے کی بات ہے، اس کا شمار اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کرنے میں ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں عورت کے بارے میں یہ چیز طے شدہ تھی کہ اسے تعلیم نہیں حاصل کرنی چاہیے اور اسے گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ اگر اسے کبھی کسی ناگزیر ضرورت پر نکلنا ہی ہو تو چہرے کو ڈھک کر نکلے“۔ ۳؎

ایسی صورتِ حال میں مصر میں فرانسیسیوں کی آمد نے متعدد تبدیلیوں کے ساتھ اپنے اثرات مرتب کیے۔ جیسے مرد وزن کے درمیان آزادانہ اختلاط کو رواج ملا، ڈرامہ نگاری، تھیٹر کا رواج، رقص وموسیقی، جس میں مرد اور خواتین دونوں شریک ہوتی تھے۔ کچھ فرانسیسیوں نے تو اسلام قبول کر کے مصری خواتین سے شادیاں بھی کرلی تھیں۔ ان اسباب سے مصر پر فرانسیسی ماحول کے اثرات مرتب ہوئے۔ اس ضمن میں عبدالرحمن الجبرتی نے لکھا ہے:

> ”مصر میں جب فرانسیسی آئے تو ان میں سے بعض کے ساتھ ان کی عورتیں بھی تھیں۔ وہ لوگ عورتوں کے ساتھ سڑکوں پر ٹہلتے تھے۔ ان عورتوں کے چہرے کھلے ہوتے تھے۔ وہ رنگ برنگے کپڑے پہنے

ہوئے اپنے کندھوں پر کشمیری کپڑے اور رنگ برنگی کشیدہ کاری کی ہوئی چیزیں ڈالے ہوتی تھیں۔ وہ گھوڑوں اور گدھوں پر سوار ہوتی تھیں اور ہنسی قہقہے اور اٹکھیلیاں کرتے ہوئے ان کو تیز ہانکتی تھی۔ ان کو دیکھ کر خواہشاتِ نفس کی شکار فاحشہ اور نچلے درجے کی عورتیں ان کی طرف مائل ہوگئیں اور ان ہی کے جیسے رنگ ڈھنگ اختیار کرنے لگیں''۔۴؎

۱۷۹۸ء میں نپولین کی قیادت میں مصر پر حملہ ہوا تو وہاں کی تہذیب پر اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ بالخصوص ادبی، سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور فکری سطح پر تبدیلیاں ہوئیں۔ فرانسیسیوں کی واپسی کے بعد مصر کے حکم راں محمد علی نے لڑکیوں کی تعلیم پر زور دیا، تاکہ مردوں کی طرح وہ بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوں۔

محمد علی نے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مدرستہ الولادۃ ۱۸۳۰ء میں قائم کیا۔ ابتدا میں اس میں حبشی باندیوں کو داخلہ دلایا، پھر چند مصری لڑکیاں بھی داخل ہوئیں۔ اس مدرسہ کی فارغات میں سے بعض نے وہیں ملازمت کی اور اسی مدرسہ کے تحت المحاجر الصحیۃ (Health Centers) میں خدمات انجام دی۔۵؎ اس سلسلہ کو اسماعیل پاشا نے آگے بڑھایا۔ اس نے ایک مدرسہ قائم کیا، جس میں پانچ سو (۵۰۰) لڑکیوں کی تعلیم ہوا کرتی تھی۔ اس نے تعلیمی تحریک کے لیے اپنی بیویوں کو آگے بڑھایا۔ اس کام کے لیے اس کی تیسری بیوی جشم آفت ہانم افندی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس نے سیوفیہ میں ایک مدرسہ قائم کیا، جس میں تین سو (۳۰۰) لڑکیاں پڑھ سکتی تھیں۔ اس کی دوسری بیوی طنجہ ہانم افندی نے ۱۸۷۳ء میں دوسرا مدرسہ قائم کیا۔ خدیو اسماعیل نے ہر بڑے شہر میں تعلیم نسواں کے لیے مدارس کھولنے کی کوشش کی۔۶؎

ایک فرانسیسی مصنف دارکور نے L,EGYPTE ET LES EGYPTIANS کے نام سے فرانسیسی زبان میں ایک کتاب لکھی، جس میں اہلِ مصر

کی تہذیب وتمدن پر سخت تنقید کی اور ان کی پستی اور جہالت کو نمایاں کیا۔ خاص کر مصری خواتین کے حجاب کا التزام کرنے، اپنی سرگرمیاں بچوں کی نگہ داشت، شوہر اور خاندان تک ہی محدود رکھنے اور سماج کے دیگر معاملات سے قطع تعلق رہنے پر مذمت کی۔ اس کتاب سے مسلمانوں میں زبردست ردعمل ہوا۔ اس کے جواب میں قاسم امین نے ایک کتاب قلم بند کی، جس میں انہوں نے مصر میں اسلامی تہذیب و معاشرت اور خواتین کی حیثیت کا دفاع کیا تھا۔ اس کے فوراً بعد مرقس فہمی نامی ایک عیسائی نے ایک کتاب 'المرأۃ فی الشرق' کے نام سے تصنیف کی۔ اس نے اسلام اور مسلمانوں کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا، اسلامی حجاب کو بالکل ختم کرنے کا مطالبہ کیا، مرد وزن کے آزادانہ اختلاط کی حمایت کی، طلاق کا اختیار شوہر سے چھین کر قاضی کے حوالے کرنے، ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے پر پابندی عائد کرنے اور مسلمان خواتین اور قبطیوں کے درمیان رشتۂ ازدواج کی اجازت دیے جانے کی تجویز پیش کی۔ ۷؎

مصر میں آزادیِ نسواں کا علم بلند کرنے والے

مصر میں آزادی نسواں کی تحریک ۱۹ ویں صدی عیسوی میں پروان چڑھی۔ اس زمانے میں معاشرتی اصلاح کی جد و جہد اور حقوقِ نسواں کی آواز بلند کرنے والوں میں شیخ جمال الدین افغانی نمایاں ہیں۔ احمد امین نے اس موضوع پر ان کے افکار وخیالات کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

> ''افغانی کی مجلس میں مرد وعورت کے حقوق وفرائض اور دائرۂ کار اور پردہ کی بحث چھڑتی تو وہ ان موضوعات پر لمبی گفتگو کرتے تھے۔ ان کی رائے کا خلاصہ یہ ہوتا کہ عقلی بناوٹ میں مرد وزن مساوی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ مرد کا سر پورا اور عورت کا سر آدھا ہوتا ہے۔ ان کے درمیان جو تفاوت پایا جاتا ہے اس کا تعلق تربیت سے ہے۔ مرد کو گھر سے باہر کے کام انجام دینے ہوتے ہیں اور عورت گھر کی ذمہ داریاں اور بچوں کا کام سنبھالتی ہے۔ اس کا یہ کام مرد کی بہت سی ذمہ داریوں

سے بڑھ کر اور زیادہ ہے۔ وہ شخص غلطی پر ہے جو ہر چیز میں مرد اور عورت کے درمیان مساوات کا مطالبہ کرتا ہے۔ مرد اور عورت میں سے ہر ایک کے مخصوص فرائض ہیں۔ اگر عورت خاندان سے محروم ہو اور اس کے حالات تقاضا کریں تو اس کے گھر سے باہر کام کرنے میں کوئی حرج نہیں، بس شرط یہ ہے کہ نیت پاکیزہ اور اطوار درست ہوں۔ وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ میرے نزدیک بے حجابی میں کوئی حد نہیں، بشرطے کہ اس کو فجور کا ذریعہ نہ بنالیا جایے''۔ ۸؎

افغانی کے علاوہ مصر کے دیگر ادبا اور مفکرین نے بھی آزادیِ نسواں کی بات کی۔ انھوں نے سب سے زیادہ تعلیم نسواں پر زور دیا۔ اس کے بعد دیگر حقوق کا بھی مطالبہ کیا۔ انہوں نے مرد وزن کے اختلاط کی کھلی اجازت دی، پردہ کو ایک فرسودہ روایت بتا کر اتار پھینکنے پر اکسایا۔ انہوں نے عورت کو یہ یقین دلایا کہ زمانہ کی ترقیوں کا ساتھ دینے کے لیے اسے سماج کی پابندیوں سے آزاد ہونا ہوگا۔ اور ہر اس کام میں حصہ لینا ہوگا جو مرد انجام دیتے ہیں۔ تعدد ازواج کو انہوں نے خواتین کے حقوق پر شب خوں قرار دیتے ہوئے اس پر پابندی کا مطالبہ کیا، مرد کے حقِ طلاق کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے خواتین کو بھی طلاق کا حق دیے جانے یا کم از کم مرد سے یہ حق لے کر قاضی کے حوالے کر دینے کی بات کہی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ آزادی نسواں کی یہ تحریک برپا کرنے والے زیادہ تر مسلمان تھے، انہوں نے اپنے خیالات کو قرآنی آیات اور احادیثِ نبوی کے ذریعہ مدلل کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح انہوں نے یہ ثابت کرنا چاہا کہ اسلام نے خواتین پر کوئی پابندی عائد نہیں کی ہے۔

رفاعہ رافع طہطاوی کو جدید مصری فکر کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے مصر کی ثقافتی ترقی میں اہم کردار سرانجام دیا۔ انہوں نے تعلیم نسواں کی پہلی آواز بلند کی۔ وہ محض ایک عالم و ادیب ہی نہیں تھے، بلکہ ایک عظیم مصلح بھی تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب 'المرشد الأمین للبنات والبنین' میں خواتین کے لیے علم کے دروازے

کھولنے کی دعوت دی ،تاکہ وہ اولاد کی تربیت، شوہر کے ساتھ حسن سلوک اور گھر کے معیار کی بلندی کے سلسلے میں اپنی مطلوبہ ذمہ داریاں ادا کرسکیں۔ساتھ ہی علم کی بنا پر وہ مکارمِ اخلاق سے آراستہ اور معاشرہ کی خدمات پر قادر ہوسکیں۔انھوں نے اپنی تصنیف میں خواتین کی حیثیت اور حقوق اور دیگر معاشرتی مسائل سے بحث کی، بالخصوص یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شرافت یا بے حیائی کا تعلق پردے یا بے پردگی سے نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق درحقیقت تربیت سے ہے۔اگر کسی کی تربیت اچھی ہوتو اس سے عفت وشرافت کا مظاہرہ ہوگا،خواہ وہ پردے کا اہتمام کرے یا نہ کرے۔۹؎

احمد فارس الشدیاق نے اپنی تحریروں میں انگلینڈ اور فرانس کی تہذیب و تمدن،طرزِ معاشرت، رسم ورواج اور خاص طور سے خواتین کی آزادی و بے پردگی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مرد وزن کے درمیان آزادانہ اختلاط کے حامی تھے اور پردہ کو فرسودہ سمجھتے تھے۔اسی لیے انہوں نے اپنی تصنیف میں جگہ جگہ برقعہ کو تضحیک کا نشانہ بنایا ہے۔انھوں نے فرانس کے مشاہدات واحساسات پر دو کتابیں لکھی ہیں: ’ **الساق علی الساق فیما ھو الفاریاق** ‘ اور ’ **کشف المخبأعن فنون أوربا** ‘۔ ان میں اس نے حقوقِ نسواں سے متعلق بھی لکھا ہے۔ بالخصوص تعلیم نسواں پر ان کے نظریات کچھ اس طرح ہیں:

> ’’اگر تم یہ کہو کہ ہمارے پاس عربی میں ایسی کتابیں نہیں جو خواتین کے لیے مناسب ہوں تو میں کہوں گا کہ ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔لیکن کیا انگریزوں کے یہاں خواتین اور بچوں کے لیے ایسی مخصوص کتابیں نہیں ہیں جنہیں ماہرینِ فن اور دانش وروں نے تالیف کیا ہے۔ پھر تم ان سے دیگر سامان تو خریدتے ہو،لیکن علم ،حکمت اور آداب نہیں حاصل کرتے۔کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کرے گا کہ بچپن کی تعلیم پتھر کی لکیر ہوتی ہے‘‘۔۱۰؎

احمد فارس نے خواتین کے لیے اس طرح کی کتابیں پڑھنا پسند کیا جن میں

اخلاقیات ہوں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ لڑکیاں فنون لطیفہ سیکھنے کا اہتمام کریں تو ان کا ذہن خرافات سے پاک رہتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

> ”جہاں تک ہمارے ملک میں خواتین کو پڑھنا لکھنا سکھانے کا سوال ہے تو میرے نزدیک یہ ایک اچھی چیز ہے۔ بشرطے یہ کہ اس کا استعمال صحیح طریقے پر ہو اور وہ یہ کہ وہ ایسی کتابوں کا مطالعہ کریں جن سے اخلاق سنوریں اور املا درست ہوجائے۔ جب خواتین تحصیلِ علم میں مشغول ہوں گی تو سازشوں کا جال بننے، مکر و فریب اور حیلے تراشنے سے ان کی توجہ ہٹ جائے گی۔ شادی شدہ خواتین میری اس کتاب اور اسی جیسی دوسری کتابوں کا مطالعہ کرسکتی ہیں۔ جس طرح بعض کھانے صرف شادی شدہ لوگ کھاسکتے ہیں۔ یہی حال کلام کی بعض قسموں کا ہے“۔[۱۱]

اس زمانے میں تعلیم نسواں کی ترغیب دینا بڑی جرأت کی بات تھی، کیوں کہ لڑکیاں گھر کی چار دیواری میں بند رہ کر جہالت کی زندگی گزارتی تھیں۔ وہ گھریلو کام کاج، بچوں کی نگہ داشت اور دیگر گھریلو کاموں میں لگی رہتی تھیں۔

احمد فارس شدیاق نے اپنی دوسری کتاب ’**کشف المخبّأ عن فنون اوربا**‘ میں مردوں اور خواتین کے مساوی حقوق کی بات اٹھائی۔ ان کا خیال ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مردوں کو ایک پہلو میں امتیاز دیا ہے تو خواتین کو بھی دوسری خصوصیات سے نوازا ہے۔ اس طرح دونوں کے درمیان توازن پیدا کیا ہے۔ مثلاً اگر مرد کو قوت و طاقت دی ہے، تاکہ وہ روزی کما سکے، تو عورت کو صبر، گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کی تربیت کی صلاحیت دی ہے۔ اگر مرد کو مضبوط جسم عطا کیا گیا ہے تو عورت حسن و جمال کی مالک ہوتی ہے۔ مرد عزتِ نفس سے بہرہ ور ہے تو عورت کو حیا کی دولت ملی ہے۔

علی پاشا مبارک نے متعدد کتابیں قلم بند کی ہیں۔ ان کی کتاب ’عَلَم الدین اصلاً سفرنامہ ہے۔ اس میں تاریخ، لغت اور دیگر علوم وفنون سے متعلق معلومات بھی

جابجا ملتی ہیں۔ اس کتاب کو غیر معمولی شہرت ملی۔ اس میں انہوں نے کنایہ اور محاکاۃ کے اسلوب میں معاشرتی اصلاح سے متعلق اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ اس میں یورپی کلچر کی ترقیوں کا ذکر ہے۔ اس کا مقصد اہل مصر کو بھی یورپی تہذیب سے استفادہ کی ترغیب دینا تھا۔ اسی طرح انہوں نے خواتین کی تعلیم وتربیت پر زور دیا اور انہیں جہالت وناانصافی سے آزادی دلانے کی کوشش کی۔

'علم الدین' جدید عربی ادب کا اولین نمونہ ہے۔ اس کا اسلوب افسانوی ہے۔ اس میں علی مبارک نے خواتین کی تعلیم وتربیت اور ان کے دیگر حقوق پر زور دیا ہے۔ مرد وزن کے درمیان پاکیزہ اختلاط کی اجازت دی ہے۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے 'علم الدین' نامی ایک انگریزی سیاح کی زبانی کیا ہے، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ خیالات خود ان کے بھی ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ہم وطن بھی انہی خیالات کے حامل بن جائیں۔ علی پاشا تعلیم نسواں کے حامی تھے، تاکہ خواتین بھی علم ومعرفت کے اعلیٰ معیار تک پہنچیں۔

محمد عبدہ نے دیکھا کہ مصر معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی لحاظ سے انحطاط کا شکار ہے۔ غیر ملکی تسلط نے مصری کلچر کی جڑیں کھوکھلی کردی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے نصابِ تعلیم میں جدید علوم کا اضافہ کیا۔ بالخصوص لڑکیوں کی تعلیم کو ضروری سمجھا، تاکہ وہ بھی عزت وتکریم کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔ انہوں نے زندگی کے تمام امور میں عورتوں کو مردوں کے مساوی قرار دیا۔ انہوں نے جریدہ 'الوقائع المصریۃ' میں ۱۸۸۱ء 'حاجۃ الانسان الی الزواج' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا، جس میں یہ وضاحت کی کہ شادی کا مقصد محض خواہشات کی تکمیل نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد ایک خاندان اور ایک معاشرہ وجود میں لانا ہے۔ ۱۲؎

عبدالرحمن الکواکبی نے اپنی کتاب 'ام القریٰ' میں تعلیمِ نسواں پر بہت زور دیا ہے اور عورت کی جہالت کو امت کی پس ماندگی اور انحطاط کا سب سے بڑا سبب بتایا ہے۔ انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہؓ اور دیگر صحابیات کی مثال پیش کرتے

ہوئے کہا ہے کہ عہدِ اول میں بڑی بڑی عالمات، فقیہات، شاعرات اور محدثات گزری ہیں، جو ہمارے لیے اس بات کا نمونہ ہیں کہ تعلیم خواتین کے لیے بھی ضروری ہے۔ علم عفت اور پاک دامنی کا ضامن ہے، جب کہ جہالت فسق وفجور کا ذریعہ ہے اور اولاد کی تربیت کے لیے بھی مضر ہے۔

قاسم امین عالم عرب میں 'محرّر المرأة' (آزادیِ نسواں کا علم بردار) کے لقب سے جانے جاتے ہیں۔ ان سے پہلے اگرچہ متعدد حضرات نے خواتین کے حقوق کے سلسلہ میں اپنی آواز بلند کی تھی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، مگر ان کی دعوت صرف عورت کی تعلیم تک محدود تھی۔ زندگی کے دیگر مسائل پر اگر انہوں نے کچھ کہا تو بس سرسری طور سے نہایت مدھم آواز میں، لیکن قاسم امین نے تعلیم کے ساتھ دوسرے مسائل پر بھی خصوصی توجہ دی۔ انہوں نے پر زور انداز میں تعلیم کے ساتھ دیگر معاشرتی حقوق کی بات کہی اور عورت کی آزادی کو ایک تحریک کی شکل دے دی۔

قاسم امین کی کتاب 'تحریر المرأة' آزادی نسواں سے متعلق پہلی کتاب ہے۔ اس نے پورے عالم عرب میں تہلکہ مچادیا۔ اس سے قبل معاشرتی موضوعات پر اگرچہ متعدد کتب لکھی جا چکی تھیں، لیکن اس کتاب کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں خواتین کی تعلیم وتربیت پر زور دیا گیا ہے۔ قاسم امین نے لکھا ہے:

> ''ضروری ہے کہ عورت بھی مرد کی طرح کم از کم ابتدائی تعلیم کرے، تاکہ اسے بھی علوم کی مبادیات سے واقفیت ہو۔ اس کے بعد اسے اجازت ہو کہ اپنے ذوق کے مطابق وہ جو علم چاہے، حاصل کرے''۔ ۱۳؎

سعد زغلول کا ۱۹۱۹ء میں برپا ہونے والی آزادی نسواں تحریک میں اہم کردار ہے۔ یہ قاسم امین کے گہرے دوست تھے۔ خواتین کے حقوق کے حامی تھے۔ انہوں نے ایک موقع پر ان الفاظ میں اظہار خیال کیا تھا: ''میں آزادی نسواں کے حامیوں اور اس کے قائلین میں سے ہوں۔ اس لیے کہ آزادی کے بغیر ہم اپنے

مقصد کو نہیں پہنچ سکتے۔ میرا یہ یقین آج نہیں، بلکہ ایک طویل زمانے سے ہے۔ میرے مرحوم دوست قاسم امین بک نے اپنی کتاب **'المرأۃ الجدیدۃ'** میں (جس کا انتساب انہوں نے میری طرف کیا ہے) جن خیالات کا اظہار کیا ہے، میں ان سے متفق ہوں۔ مصری عورت نے ہماری وطنی تحریک میں جو کردار انجام دیا ہے۔ وہ بہت عظیم اور مفید ہے''۔ ۱۴؎

محمد حسین ہیکل بھی حقوقِ نسواں کے حامی تھے۔ اس موضوع پر کا شاہ کار ناول 'زینب' ہے، جسے انہوں نے پیرس کے زمانۂ طالب علمی میں ۱۹۱۰ اور ۱۹۱۱ء کے درمیان لکھا تھا۔ اس ناول میں جابجا بہت سی معاشرتی برائیوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ مثلاً نکاح کے معاملے میں عورت کے حقوق کو نظر انداز کیا جانا، خاندان کی تشکیل سے متعلق غلط نظریہ رکھنا وغیرہ اس کہانی کا مرکزی خیال ہے۔ منجملہ یہ ناول خواتین کے بنیادی حقوق کی عکاسی کرتا ہے۔

عبدالقادر المغربی عورت کی تعلیم کے حامی اور شرعی حجاب کے قائل تھے۔ انہوں نے قاسم امین کی آزادی نسواں کی دعوت کو سراہا اور اس کی دونوں کتابوں 'تحریر المرأۃ' اور **'المرأۃ الجدیدۃ'** کو پسند کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ شرعی حجاب نہ تو یہ ہے کہ عورت ہمیشہ کے لیے گھر میں قید کر دی جائے اور باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ بالکل منقطع کر دیا جائے اور نہ وہ ہے جس کی دعوت قاسم امین نے دی ہے، بلکہ حجابِ شرعی ان دونوں کے درمیان کی راہ ہے۔ انہوں نے یہ بات زور دے کر کہی ہے کہ حجاب کبھی عورت کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ ۱۵؎ انہوں نے صراحت سے اپنا نقطہ نظر ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''عورت انسانی مخلوق ہے۔ وہ مرد کے مثل قوتیں اور صلاحیتیں رکھتی ہے۔ علم کا حصول اس پر فرض ہے اور ضروری ہے کہ اسے مکمل آزادی حاصل ہو، تصرف کا اختیار ہو اور تمام حقوق حاصل ہوں''۔ ۱۶؎

احمد لطفی السید نے شیخ محمد عبدہ کے مکتبِ فکر سے کسبِ فیض کیا تھا۔ وہ قاسم

امین کی آزادیِ نسواں کی دعوت سے پوری طرح متفق تھے۔ ۱۸۹۷ء میں قاسم امین نے جنیوا میں اپنی کتاب **'تحریر المرأۃ'** کے کچھ حصے انہیں سنائے تھے۔ انہوں نے خود بھی **'الجریدۃ'** میں حقوقِ نسواں کی حمایت میں متعدد مقالات لکھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے باحثہ بادیہ کی کتاب **'النسائیات'** پر مقدمہ لکھا ہے، جس میں حقوقِ نسواں کی ان کی دعوت کی تعریف وتحسین کی ہے۔ ۱۷؎

لطفی السید نے اپنی کتاب **'المنتخبات'** میں حقوقِ نسواں کو موضوع بنایا۔ خاص کر حجاب اور بے پردگی اور کم سنی کی شادی کے نقصانات بیان کیے۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں شادی میں تاخیر کی مذمت کی اور طلاق کی کثرت اور تعدد ازواج کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ انہوں نے تحریک نسواں کا تعارف کرانے کے لیے ایک مقالہ **'الحرکۃ النسائیۃ فی مصر'** کے عنوان سے لکھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ''قوم کی آزادی کے لیے عورت کی آزادی ناگزیر ہے۔ اگر معاشرتی میدان میں ہماری خواتین آزاد ہوجائیں تو ہمیں قومی آزادی حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔''

ہدیٰ ہانم شعراوی نے دیکھا کہ مصری خواتین جہالت اور مظلومیت کی زندگی گزار رہی ہیں اور حکومت کی توجہ سے محروم ہیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ تعلیم ہی عورت کو اس تاریکی سے نکالنے کا واحد راستہ ہے۔ انہوں نے حکومت سے خواتین کو تعلیمی مواقع اور سہولیات فراہم کرنے کا مطالبہ کیا۔ جامعۃ الدول العربیۃ کے قیام کے وقت ہدیٰ شعراوی نے ایک میمورنڈم بھیجا، جس میں خواتین کی جانب سے اس کی تائید کا اظہار کیا۔

باحثہ بادیہ نے ایک پاکیزہ معاشرہ کو وجود میں لانے کے لیے لڑکیوں کی تعلیم کے ساتھ دیگر معاشرتی مسائل کو بھی موضوع بحث بنایا، مثلاً نکاح، تعدد ازواج، پردہ وغیرہ۔ انہوں نے بے پردگی اور آزادانہ اختلاط پر بھی کھل کر بحث کی۔ انہوں نے قلم کے ذریعہ لڑکیوں کو ان کی بہت سی ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور ان غلطیوں کی نشان دہی کی جن سے خاندان تباہی و بربادی کا شکار ہوجاتا ہے۔ انہوں نے لڑکیوں کو معاشرہ

کا ایک اہم حصہ بتایا، ان کی صحیح اسلامی تربیت پر لوگوں کو ابھارا۔ انہوں نے خواتین کے لیے پردے کو ضروری قرار دیا اور بے پردگی کو فساد کی جڑ بتایا۔ مرد وزن کے آزادانہ اختلاط کی سخت مذمت کی۔ انہوں نے خواتین کے حقوق کی پرزور طریقہ سے حمایت کی۔ ۱۹۱۱ء میں باحثہ بادیہ نے پہلی مصری کانفرنس میں ایک تقریر کی، جس میں خواتین کے حقوق سے متعلق تفصیل سے بحث کی۔ ان کی تحریروں میں بھی معاشرتی اصلاح اور آزادی نسواں کے سلسلہ میں خاصا مواد موجود ہے۔ انہوں نے عورت کو معاشرہ کا ایک اہم حصہ بتایا۔ ان کا خیال تھا کہ معاشرہ کی ترقی عورت کی ترقی پر منحصر ہے۔ خواتین کو تعلیم سے آراستہ کرنا بہت ضروری ہے۔ عورت کی آزادی کا مطالبہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ عورت کی آزادی اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ اس کی گود میں پروان چڑھنے والی نسل بھی آزادی کی فضا میں سانس لے۔ انہوں نے مزید کہا کہ عورت کی آنکھوں سے اوہام وخرافات کے پردے ہٹائے جائیں، تاکہ زندگی کی حقیقت اور عظمت اس کے سامنے آشکارا ہو سکے۔

باحثہ بادیہ کی تصنیف 'النسائیات' مقالات کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے خواتین کے مسائل پر لکھی تھی۔ وہ لڑکیوں کی درست تعلیم وتربیت پر زیادہ زور دیتی ہیں، تاکہ زوجیت کے فرائض، شوہر کی خدمت اور بچوں کی صحیح نگہ داشت کرسکیں اور اپنے وطن کی ترقی کے لیے بہترین خدمات انجام دے سکیں۔ وہ کم سنی کی شادی کی مخالف تھی۔ اسی طرح وہ عمر رسیدہ شخص کی شادی کم سن لڑکیوں سے کرنے کی بھی مخالف تھی۔ وہ کہتی ہیں کہ شادی کے وقت دونوں کی عمروں میں برابری کا خیال رکھا جائے، تاکہ دونوں پرسکون زندگی گزار سکیں۔ انہوں نے لکھا ہے:

> ''زوجین کی عمروں میں یکسانیت پر بڑی حد تک موافقت اور محبت کا دار و مدار ہوتا ہے۔ ضروری ہے کہ لڑکی کی شادی اس وقت کی جائے جب وہ نکاح کی اہل اور اس کے مسائل برداشت کرنے کے لائق ہوجائے۔ ایسا سولہ (۱۶) سال سے پہلے نہیں ہونا چاہیے۔ کم عمر لڑکیوں

کی شادی کھلواڑ ہے۔ اس میں متعدد وجوہ سے امت کی شقاوت ہے۔ مثلاً اس صورت میں ازدواجی مسائل پیدا ہوتے ہیں جس کا نتیجہ ہمیشہ ناموافقت یا علیٰحدگی کی صورت میں سامنے آتا ہے، کثرت سے بچوں کی اموات ہوتی ہیں، نسل کم زور ہوتی ہے اور خواتین اعصابی اور دیگر نسوانی امراض کا شکار ہوجاتی ہیں۔ دو مختلف عمر کے جوڑوں کے باہم نکاح سے بچے کم زور پیدا ہوتے ہیں اور زوجین میں ناموافقت جنم لیتی ہے۔ نیز فطرت کا دقیق نظام بدل جاتا ہے''۔ ۱۸؎

طٰہٰ حسین نے بھی آزادیِ نسواں کی پرزور حمایت کی۔ ان کے نزدیک آزادی کا حق جس طرح مرد کو حاصل ہے اسی طرح یہ حق عورت کو بھی ملنا چاہیے۔ ان کے نزدیک حجاب عورت کی آزادی پر قدغن ہے۔ اس لیے وہ عورت کو اسے اتار پھینکنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ۱۹۱۱ء میں انہوں نے مقالات کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا، جس میں اسی قسم کے خیالات پیش کیے تھے:

''آزادی کے معاملہ میں مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ دونوں کو اچھے اخلاق کا حکم دیا گیا ہے، برے اخلاق سے روکا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ بدگمانی کے مواقع سے بچیں۔ عورت کو چاہیے کہ کسی اجنبی کے ساتھ تنہائی میں نہ رہے، تنہا سفر نہ کرے اور جاہلیت اولیٰ کی طرح بناؤ سنگار نہ کرے۔ اس کے بعد اسے آزادی ہے، جو چاہے کرے، البتہ کوئی برا یا لغو کام کرنے سے احتراز کرے۔ اسی طرح اسے حق ہے کہ نقاب اتار پھینکے اور حجاب الٹ دے اور دنیا کی لذتوں سے اسی طرح بہرہ ور ہو جس طرح مرد لطف اندوز ہوتا ہے۔ پھر کوئی حرج نہیں کہ وہ ایسے کام انجام دے جو اس کی اپنی ذات کے لیے، اس کے شوہر کے لیے اور پوری نوع انسانی کے لیے اس پر واجب ہیں۔ یہ ہے اسلام کا حکم عورت کے بارے میں اور یہی ہماری بھی رائے ہے۔ جس سے ہم روگردانی کریں گے نہ کوئی دوسری رائے اختیار کریں گے''۔ ۱۹؎

خواتین کی سرگرمیاں

آزادیٔ نسواں کے علم برداروں کی کوششوں سے بیسویں صدی کے ربع اول میں لڑکیوں کو ثانوی مدارس میں علم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اعلیٰ تعلیمی ادارے ان کے لیے بند تھے، لیکن بہت جلد ۱۹۲۸ء میں ایک یونیورسٹی جامعہ فؤاد الاوّل قائم کی گئی، جس میں لڑکیوں کو پڑھنے کی اجازت دی گئی۔ جب طہٰ حسین وزیر تعلیم ہوئے تو لڑکیوں کو تعلیم کی مزید سہولیات ملی۔ یہاں تک کہ انہیں یورپ اور امریکہ کی جامعات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم ہوئے۔ ۲۰؎ جو لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکی تھیں، بعد میں انہوں نے ہی آزادیٔ نسواں کو فروغ دیا۔ بعض خواتین وزارتی مناصب پر بھی فائز ہوئیں۔ اس طرح آزادیِ نسواں کی حامی مصری خواتین کا ایک ایسا گروپ تیار ہو گیا، جس نے خود اپنے حقوق اور مسائل کے لیے آواز بلند کی، حتیٰ کہ سیاسی اور سماجی میدانوں میں مردوں کی برابری کا دعویٰ کیا۔ اس کے لیے ان خواتین نے متعدد تحریکیں چلائیں، کانفرنسیں کیں اور احتجاجی مظاہرے کیے۔ ان خواتین کی سرگرمیاں صرف سماجی فلاحی وبہبود تک محدود نہ تھیں، بلکہ انھوں نے رفاہی تنظیمیں، اسپتال، یتیم خانے اور تعلیم گاہیں بھی قائم کیں، تاکہ مریضوں، زخمیوں اور مفلوک الحال عوام کی خبر گیری اور دیکھ بھال ہو سکے۔ ۱۹۳۶ء کے ربع اخر میں **جمعیة حسین الصحیة** کا قیام ہوا۔ اس سوسائٹی کا نصب العین لوگوں کی مدد کرنا تھا۔

آزادی نسواں کی تحریک میں مصطفی فاضل کی بیٹی امیرہ نازلی فاضل نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ ۲۱؎ اس کے بارے میں مختلف نظریات ہیں۔ کسی نے اسے اسلام پسند کہا تو کسی نے امریکی ڈاکٹر سے اس کی شادی کی وجہ سے اسے مرتد قرار دیا۔ اہل مصر کے دانش ورحضرات میں شیخ محمد عبدہ، سعد زغلول، لقانی محمد بیرم اور قاسم امین وغیرہ اس کی مجلس میں شامل ہوتے تھے۔ انور الجندی نے لکھا ہے کہ قاسم امین نے جب دوق دارکور کی کتاب کا رد لکھا، جس میں مصری خواتین کے اوصاف وفضائل کو سراہا تھا اور یوروپی خواتین کی نقالی پر اعتراضات کیے تھے تو بعضوں نے کہا کہ

قاسم امین کی تنقید کا نشانہ امیرہ نازلی کی شخصیت ہے۔ یہ سن کر امیرہ نازلی غیظ و غضب سے بھڑک اٹھیں، انہوں نے سخت باتیں کہیں، تب قاسم امین نے انہیں خوش کرنے کے لیے اپنی کتاب 'تحریر المرأۃ' لکھی۔ ۲۲؎

مصر میں آزادیِ نسواں کی تاریخ میں ۱۹۱۹ء ایک انقلابی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سال خواتین نے چار دیواری سے نکل کر مردوں کے دوش بہ دوش برطانوی استعمار کے خلاف سڑکوں پر مظاہرے کیے اور جانوں کی قربانیاں پیش کیں۔ ۹ / مارچ ۱۹۱۹ء کو برطانوی استعمار کے خلاف مصری قوم نے پہلا احتجاجی جلوس نکالا۔ اس میں طلبہ بھی شامل تھے اور خواتین کھڑکیوں اور روشن دانوں سے نعرے لگا رہی تھیں۔ اگلے مظاہروں میں خواتین خود بھی شریک ہوئیں۔ اسی طرح کا مظاہرہ ۱۴ / مارچ کو بھی ہوا تھا، جس میں مظاہرین اور برطانوی فوج کے درمیان جھڑپ میں ۱۲ / افراد شہید ہوئے، جن میں سرفہرست حمید خلیل نامی خاتون تھی۔ اس کی شہادت نے مصری خواتین کو مشتعل کر دیا۔ انہوں نے ۲۸ گھنٹوں کے اندر ایک احتجاجی جلوس نکالا۔ اس موقع پر جو میمورنڈم پیش کیا گیا، ان میں مُہتھے مظاہرین پر برطانوی حکومت کی اندھا دھند فائرنگ کی مذمت اور اہل مصر کے حق آزادی کی حمایت کی گئی۔ اس مظاہرے کا نقشہ عبدالرحمن الرافعی نے کچھ اس طرح کھینچا ہے:

> ''خواتین دو صفوں میں ترتیب سے روانہ ہوئیں۔ وہ سب چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں لیے ہوئے تھیں۔ ایک بڑے جلوس کی شکل میں شاہ راہوں سے گزریں۔ وہ 'آزادی انقلاب زندہ باد' اور 'بیرونی اقتدار مردہ باد' کے نعرے لگا رہی تھیں۔ ان کے جلوس نے عوام کی نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا اور ان کے دلوں میں جوش و جذبہ اور پسندیدگی کی روح پھونک دی۔ ہر جگہ لوگوں نے تالیاں بجا کر اور نعرے لگا کر ان کا استقبال کیا۔ خواتین نے گھروں کی کھڑکیوں اور جھروکوں سے ان کی حمایت میں نعرے بلند کیے۔ قاہرہ کی اکثر آبادی، خواہ وہ مردوں کی ہو یا خواتین کی، اس عظیم اور بے مثال جلوس کو دیکھنے کے لیے امنڈ آئی اور انہی کی آواز میں آواز ملا کر نعرے بلند کرنے لگی''۔ ۲۳؎

اس احتجاجی جلوس نے مختلف سفارت خانوں میں پہنچ کر اپنا میمورنڈم پیش کیا۔ واپسی میں اس نے 'بیت الأمۃ' جانے کا قصد کیا۔ برطانوی پولیس نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی اور ان پر سختیاں کیں، لیکن جلوس برابر جاری رہا۔ بیت الأمۃ تک پہنچ کر وہاں احتجاجیوں نے بیرونی ممالک کے نمائندوں کو دوسرا میمورنڈم دیا، جس میں برطانوی حکومت اور پولیس کی شکایت تھی۔ اس میمورنڈم پر بہت سی خواتین نے دستخط کیے تھے۔ اس کے بعد ۷ / دسمبر کو ملنر کمیشن کے مصر آنے پر خواتین نے اس کے خلاف احتجاج کرنے اور اس کا بائیکاٹ کرنے کا پروگرام بنایا۔ انہوں نے ایک قومی کانفرنس بھی منعقد کی۔ اس مظاہرے نے انقلاب کی ایک لہر دوڑا دی، جس سے پورے مصر میں ہلچل مچ گئی، یہاں تک کہ پولیس نے کئی مقامات میں فائرنگ کردی، کئی خواتین شہید ہوگئیں، جن میں زیادہ تر برقع پوش تھیں۔

آزادیِ نسواں کی تحریک کو فروغ دینے میں ہدی ہانم شعراوی اور سعد زغلول کی بیوی صفیہ زغلول کا کردار بھی نمایاں ہے۔ ۲۴ ان احتجاجیوں نے تعلیم نسواں، تعدد ازواج، طلاق اور دیگر معاشرتی مسائل کو موضوعِ بحث بنایا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ زوجین کے درمیان باہمی مودت و محبت مطلوب ہوتی ہے، اس لیے دونوں کی عمروں میں زیادہ تفاوت نہ ہونا چاہیے۔ اور نابالغ اور کم عمر لڑکیوں کے نکاح پر پابندی ہونی چاہیے۔ زیادہ بیویاں رکھنے سے پہلی بیوی کو تکلیف پہنچتی ہے، اس لیے تعدد ازواج ممنوع ہونا چاہیے۔ طلاق کو کم سے کم اور محدود کرنے کے لیے اس کا اختیار مرد سے لے کر قاضی کے حوالے کردینا چاہیے۔

مصری صحافت

آزادی نسواں کی حمایت میں مصری صحافت کا بھی اہم کردار رہا ہے۔ ۱۸۸۲ء میں ماہانہ مجلہ 'الاستاذ' میں مدرسۃ البنات کے عنوان سے ایک کالم ہوا کرتا تھا، جس میں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر لکھا جاتا تھا۔ علی یوسف نے المؤیّد نامی

ایک روزنامہ جاری کیا، جس نے آزادی نسواں کے معاملے میں اہم کردار ادا کیا۔ قاسم امین نے خواتین کی اصلاح، تعلیم و تربیت کے علاوہ معاشرتی حقوق پر متعدد مضامین لکھے، جنہیں بعد میں 'اسباب و نتائج و اخلاق و مواعظ' کے نام سے کتابی شکل دی گئی۔ سب سے پہلے احمد لطفی السید کے مقالات ان کے روزنامے 'الجریدۃ' میں شائع ہوا کرتے تھے۔ اس طرح جب اس تحریک کو ترقی ملی تو یہ رسائل اسی نام سے جاری رہے۔ عبدالحمید حمدی نے ۱۹۱۵ء میں قاہرہ سے ہفتہ وار جریدہ 'السفور' نکالا۔ اس مجلہ میں حجاب اور اسلامی آدابِ معاشرت کے خلاف مضامین شائع ہوتے تھے۔ جرجی زیدان کے جریدہ 'الھلال' اور محمد حسین ہیکل کے جریدہ 'السیاسیۃ' میں بھی اس موضوع پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں دریہ شفیق نے نسائی حقوق کے لیے 'بنت النیل' مجلہ جاری کیا، جس میں آزادی نسواں کی فکر کو آگے بڑھایا۔ اس مجلہ کی مقبولیت کے بعد اس نے ایک تنظیم قائم کی، جس کا مقاصد خواتین کے غیر مساویانہ مسائل کا حل تھا۔ اس تنظیم کو سیاسی حقوق کا علم بردار سمجھا جانے لگا۔ اس تنظیم نے ۱۹۵۱ء میں بغیر اجازت پارلیمنٹ میں گھس کر اپنے مطالبات کا مظاہرہ کیا، جس کی بنا پر دریہ شفیق پر مقدمہ چلا۔ ۲۵ء مصری دستور میں مرد و زن کو دستوری انتخاب کا حق دیا گیا، لیکن ارکان پارلیمان کو منتخب کرنے کا حق صرف مردوں کو دیا گیا۔ اس پر دریہ شفیق نے ۱۹۵۲ء میں ایک تحریک چلائی، لیکن کچھ مخالفین کی وجہ سے وہ کام یاب نہ ہوسکی۔ ۱۹۵۴ء میں دریہ شفیق نے نئے دستور کی تاسیسی کمیٹی کے قیام کے لیے مسلسل آٹھ دن بھوک ہڑتال کی، جس کے نتیجے میں حکومتی سطح پر اسے کچھ حد تک ہمدردی ملی۔

بیسویں صدی کے ربع اول تک خواتین کو ممبر شپ نہیں تھی۔ وہ الحزب الوطنی کے پروگراموں میں شرکت کرتی تھیں، اس کی کانفرنسوں میں اظہارِ خیال کرتی تھیں اور اس کے تحت ہونے والے مظاہروں میں شامل ہوتی تھیں۔ بہت جلد ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ خواتین خود کمیٹیاں اور سوسائٹیاں تشکیل دینے لگیں۔ مصری خواتین کو ۱۹۱۹ء کے انقلاب سے کافی حد تک دستوری مساوات حاصل

ہوئی۔ ۱۹۲۳ء کے دستور میں مرد و زن کو مساوی حقوق دیے گئے۔ لیکن بہت جلد قانونِ انتخاب نافذ ہوا تو خواتین پھر ایک بار حقوق سے محروم ہوگئیں۔ لیکن اسی سال ہدیٰ شعراوی کی رہ نمائی میں خواتین کی پہلی تنظیم 'الاتحاد النسایی' کے نام سے قائم ہوئی۔ ۲۶؎ اس کی وجہ سے خواتین کو امیدواری اور ووٹنگ کا حق حاصل ہوا۔ پھر جب قانونِ انتخاب کے ذریعہ اس حق کو سلب کرلیا گیا تو اس تنظیم نے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کی۔ اس نے تعلیم نسواں کے کئی ادارے قائم کیے۔ دیگر ممالک کی نسائی تنظیموں سے بھی اس نے تعلقات قائم کیے۔ ۲۷؎

تحریک آزادی نسواں اور شعراء

مصر میں آزادیِ نسواں کی تحریک میں شعراء نے بھی اپنا کردار نبھایا ہے۔ انہوں نے تعلیمِ نسواں، حجاب، تعددِ ازواج، نکاح و طلاق کے علاوہ دیگر موضوعات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اس سے تحریکِ نسواں کو فائدہ ہوا۔ اس عہد کے نمائندہ شعراء میں رفاعہ رافع طھطاوی، احمد فارس شدیاق، حافظ ابراہیم، خلیل مطران، ولی الدین یکن، احمد محرم، احمد شوقی اور باحثہ بادیہ وغیرہ کا نام قابلِ ذکر ہے۔

یہ ہے مصر میں آزادیِ نسواں کے میدان میں کی جانے والی کوششوں کا مختصر جائزہ۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کوششوں میں اسلامی حدود و قیود کی پوری پابندی نہ کی جا سکی۔ اسلام پسند ادبا و شعرا، مفکرین اور اصحابِ علم نے اسلامی قدروں کو نمایاں کرنے اور معاشرہ کی اصلاح کی اپنی سی کوشش ضرور کی، لیکن وہ پوری طرح کام یاب نہ ہو سکے۔

حواشی و مراجع

(1) B.S. Anderson and J.P Zinsser, A history of their own (Women in Europe from prehistory to the present) Penguin Books, England, 1990.voll ii p.334.

(2) christine de pizan, The book of the city of ladies, tans earl jeffrey richards, New York. Persea Books. 1982. p,5

۳۔ عائشہ تیموریہ (۱۸۴۰۔۱۹۰۲ئ) کی تعلیم اسی انداز پر ہوئی تھی۔
۴۔ عجائب ال آثار، عبدالرحمن الجبرتی، ج ۳، ص ۱۶۱۔
۵۔ تطور النھضۃ النسایۃ فی مصر، دریہ شفیق و ابراہیم عبدہ، ص ۲۹۔ ۳۲
۶۔ حوالہ سابق، ص ۴۹
۷۔ عودۃ الحجاب، محمد احمد اسماعیل، ص ۲۸۔۲۹
۸۔ زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث، احمد امین، س ۱۱۴
۹۔ رفاعہ طھطاوی، تخلیص الابریز فی تلخیص باریز، ۱۸۲۱ء
۱۰۔ احمد فارس شدیاق، الساق علی الساق فیما ھو الفاریاق، الکتاب الثانی، ص ۳۲۰
۱۱۔ حوالہ سابق، ص ۱۲۶
۱۲۔ تاریخ الامام الشیخ محمد عبدہ، سید رشید رضا، ج ۶، ص ۱۰۹۔ ۱۱۲
۱۳۔ قاسم امین، 'تحریر المرأۃ'، ص ۱۷
۱۴۔ آثار الزعیم سعد زغلول، ابراہیم الحریزی، ص ۳۷
۱۵۔ کلمتان فی السفر والحجاب، عبدالقادر المغربی، ص۔ ۱۔۱۱
۱۶۔ حوالہ سابق، ص۔ ۱۳
۱۷۔ النسائیات، باحثہ بادیہ، مقدمہ از لطفی السید۔
۱۸۔ باحثہ بادیہ، النسائیات، ص ۳۵
۱۹۔ أدباء معاصرون، رجاء النقاش، ص۔ ۲۷
۲۰۔ تطور النھضۃ النسایۃ، ص ۸۔ ۸۸
۲۱۔ مقالہ، صالون نازلی ہانم، ڈاکٹر سید فہمی ثناوی، مجلۃ الھلال، ۴/ستمبر ۱۹۸۲ئ، ص ۴۳
۲۲۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے المحافظۃ والتجدید فی مصر، انور الجندی، ص۔ ۱۳۱
۲۳۔ ثورۃ ۱۹۱۹ئ، عبدالرحمن الرافعی، ج ۱، ص، ۱۸۶
۲۴۔ ڈاکٹر سطوت ریحانہ، مصر میں آزادی نسواں کی تحریک اور جدید عربی ادب پر اس کے اثرات، طبع علی گڑھ، ۲۰۰۱ئ، ص ۶۷
۲۵۔ المرأۃ المصریۃ، ص ۲۲۱۔ ۲۲۳
۲۶۔ حوالہ سابق، ص ۱۳۳۔ ۱۳۴
۲۷۔ حوالہ سابق، ص ۱۴۴۔ ۱۴۵

بحث ونظر

اسلامی ریاست میں مذہبی آزادی

ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی

اسلام ایک آفاقی دین ہے۔ اس کی تعلیمات میں جملہ انسانوں کے حقوق کی رعایت کی گئی ہے۔ اس نے جہاں مسلمانوں کو تمام حقوق عطا کیے ہیں وہیں غیرمسلموں کو بھی مذہبی وسماجی تحفظات فراہم کیے ہیں۔ یہ اسلامی ریاست کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے تمام شہریوں کو ان کی مذہبی رسوم، عقیدہ اور اظہار رائے کی آزادی دے۔ اسلام نے حریتِ عقیدہ کو پوری طرح تسلیم کیا ہے اور ہر فرد کو کامل آزادی عطا کی کہ وہ اپنی عقل ونظر اور فکر وفہم کو بنیاد بنا کر اپنے لیے جو عقیدہ چاہے اختیار کرے۔

بعض حضرات اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام مذہبی آزادی کا قائل نہیں ہے، بلکہ وہ نوع انسانیت کو اپنے رنگ میں رنگنے ہی میں دل چسپی رکھتا ہے۔ حالاں کہ یہ بالکل بے بنیاد اعتراض ہے۔ اسلام ایک فطری دین ہے۔ اس کی اساس رواداری، سماجی عدل اور مساوات جیسے اصولوں پر قائم ہے۔ اسلام نے ان اصولوں کو فروغ دینے کا حکم دیا ہے اور اپنے ماننے والوں کو تعلیم دی ہے کہ وہ لوگوں کو حق و باطل کے بارے میں صاف صاف سمجھائیں۔ اس کے بعد انہیں اختیار ہے کہ وہ اپنے لیے کون سا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ چاہیں تو حق قبول کرلیں اور چاہیں ضلالت وگم راہی کے راستے پر چلتے رہیں۔ ان پر زور زبردستی کرکے انہیں اسلام میں داخل نہیں کیا جائے گا۔ قرآن کا اس سلسلے میں واضح اعلان ہے:

لاَ اِکْرَاہَ فِیْ الدِّیْنِ قَدتَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَی (البقرۃ:۲۵۶)
دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ گم راہی کے مقابلے میں ہدایت کا راستہ بالکل واضح ہو چکا ہے''۔

اس آیت میں 'لا' کے ذریعہ نفی کی گئی ہے، جو 'نہی' کے معنی میں ہے اور اس میں تاکید ممانعت ہے۔ علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے:

وھذا نفی فی معنی النھی، أی لاتکرھوا أحداً علی الدین۔ ا؎
''یہ نفی 'نہی' کے معنی میں ہے اور اس کا مطلب ہے کہ دین (مذہب اور عقیدے) کے معاملے میں کسی کے ساتھ زور زبردستی نہ کی جائے''۔

علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

یقول تعالیٰ (لا اکراہ فی الدین) ای لاتکرھوا أحداً علی الدخول فی دین الاسلام، فانہ بیّن واضح علی دلائلہ و براھینہ لا یحتاج أن یکرہ أحد علی الدخول فیہ۔ ۲؎
''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ دین کے معاملہ میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ (اے مسلمانو!) تم کسی شخص کو زبردستی اسلام میں داخل کرنے کی کوشش نہ کرو، اس لیے کہ یہ دین بالکل صاف اور واضح ہے اور اس کے دلائل و براہین روشن ہیں۔ چنانچہ اس کو اس کی قطعی ضرورت نہیں کہ کسی کو زبردستی اسلام میں داخل کیا جائے''۔

علامہ زمخشریؒ نے اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے:

أی لم یجر اللہ أمر الایمان علی الاجبار و القسر، ولکن علی التمکین و الاختیار۔ ۳؎
''اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ نے ایمان کو زبردستی اور مجبوری کی بنیاد پر نہیں رکھا ہے، اس کے بجائے اس نے انتخاب اور اختیار کی آزادی دی ہے''۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودیؒ فرماتے ہیں:

''اسلام نے 'لا اکراہ فی الدین' کا اصول انسانیت کو دیا اور اس کے تحت ہر شخص کو آزادی عطا کی کہ وہ کفر و ایمان میں سے جو راہ چاہے اختیار

کرے۔قوت کا استعمال اسلام میں اگر ہے تو دو ضروریات کے لیے ہے: ایک یہ کہ اسلامی ریاست کے وجود اور اس کے استقلال کی سلامتی کے لیے میدان جہاد میں دشمنوں کا مقابلہ کیا جائے اور دوسرے یہ کہ نظم ونسق اور امن و امان کے تحفظ کے لیے جرائم اور فتنوں کا سدّ باب کرنے کے لیے عدالتی اور انتظامی اقدامات کیے جائیں۔۔۔اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے کبھی اپنی غیر مسلم رعایا کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا اور نہ کسی قوم کو مار مار کر کلمہ پڑھوایا''۔ ۴؎

درج بالا آیت کریمہ کا شانِ نزول یہ ہے کہ مدینہ میں اسلام کی آمد سے قبل اوس وخزرج کے یہاں رواج تھا کہ جس عورت کے یہاں بچہ نہیں پیدا ہوتا تھا یا پیدا ہو کر جیتا نہیں تھا، وہ نذر مانتی تھی کہ بچہ پیدا ہوا تو اسے یہودی بنادے گی۔ بچہ پیدا ہوتا تو وہ اپنی نذر کی پابندی کو لازم خیال کرتی تھی۔ جب یہود کو مدینہ سے نکالا گیا تو مسلمانوں کے ایسے بہت سے بچے، جو ان کے ساتھ تھے اور ان کے مذہب پر عمل پیرا تھے، وہ بھی ان کے ساتھ نکلے۔اس پر مسلمانوں کی فطری خواہش ہوئی کہ پہلے جو ہوا سو ہوا، اب ان کی اولاد کو یہودیت چھوڑ کر ان کے مذہب (اسلام) میں آجانا چاہیے اور یہود کے ساتھ جانے کے بجائے اپنے حقیقی ماں باپ کے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔(لآَإِکْرَاہَفِیْ الدِّیْن) اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ لوگ، جو سن شعور کو پہنچے ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنی مرضی سے یہودی مذہب اختیار کر رکھا ہے، ان کے مسلمان آباء کو انہیں زبردستی اپنے ساتھ اسلام میں لانے کا اختیار نہیں ہے۔ ۵؎

اس مضمون کی دوسری آیت ہے:

وَلَوْ شَاءَ رَبُّکَ لآمَنَ مَن فِیْ الأَرْضِ کُلُّھُمْ جَمِیْعاً أَفَأَنتَ تُکْرِہُ النَّاسَ حَتَّی یَکُونُواْمُؤْمِنِیْن (یونس ۹۹)

''اور اگر تیرا رب چاہتا، بے شک ایمان لے آتے جتنے لوگ کہ زمین میں ہیں سارے، اب کیا تو زبردستی کرے گا لوگوں پر کہ ہو جائیں

باالایمان''۔

اس کی تفسیر میں علامہ زمخشریؒ نے لکھا ہے:

ای لو شاء لقسر هم علی الایمان و لکنه لم یفعل و بنی الأمر علی الاختیار۔[۶]

''یعنی اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگوں کو ایمان کے لیے مجبور کر دیتا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور ایمان کے معاملہ کو اختیار اور آزاد پسندی کی بنیاد پر رکھا''۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے آیت کے ذیل میں لکھا ہے:

''یعنی آپ کو یہ قدرت نہیں ہے کہ زبردستی کسی کے دل میں ایمان اتار دیں۔ خدا چاہتا تو بے شک سب آدمیوں کے دلوں میں ایمان ڈال سکتا تھا، مگر جیسا کہ پہلے متعدد مواقع میں بتایا جا چکا ہے، ایسا کرنا اس کی تکوینی حکمت و مصلحت کے خلاف تھا، اس لیے نہیں کیا''۔[۷]

مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں:

''یعنی اللہ کی خواہش یہ ہوتی کہ اس کی زمین میں صرف اطاعت گزار فرماں بردار ہی بسیں اور کفر اور نافرمانی کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہوتو اس کے لیے نہ یہ مشکل ہے کہ وہ تمام اہل زمین کو مومن و مطیع پیدا کرتا اور نہ یہ مشکل ہے کہ سب کے دل اپنے ایک ہی تکوینی اشارہ سے ایمان و اطاعت کی طرف پھیر دیتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ نبی لوگوں کو زبردستی مومن بنانا چاہتے تھے اور اللہ تعالیٰ آپ کو ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔ دراصل اس فقرے میں وہی انداز بیان اختیار کیا گیا ہے جو قرآن میں ہمیں بہ کثرت ملتا ہے کہ خطاب بہ ظاہر نبی سے ہوتا ہے، مگر اصل میں لوگوں کو وہ بات سنانی مقصود ہوتی ہے جو نبیؐ کو خطاب کر کے فرمائی جاتی ہے''۔[۸]

مذکورہ شواہد کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اسلام میں حریتِ اعتقاد اپنے اختیار پر موقوف ہے، کسی کو زبردستی ایمان میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ اسی وجہ

سے مولانا ابوالکلام آزادؒ نے لکھا ہے کہ ''دین کے معاملہ میں کسی طرح کا جبر واستکراہ جائز نہیں ہے۔ دین کی راہ دل کے اعتقاد و یقین کی راہ ہے اور اعتقاد دعوت و موعظت سے پیدا ہوسکتا ہے، نہ کہ جبر واستکراہ سے''۔۹؎

اسلام پر ایمان نہ لانے کی اجازت

اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ اسلام پوری آزادی دیتا ہے کہ اگر کوئی شخص اسلام نہ قبول کرنا چاہے تو نہ کرے۔ قرآن کا اس سلسلے میں صاف اعلان ہے:

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاء فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاء فَلْيَكْفُر (کہف ۲۹)

''اور کہہ: سچی بات ہے تمہارے رب کی طرف سے، پھر جو کوئی چاہے مانے اور جو کوئی چاہے نہ مانے''۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

قُلِ اللّٰہَ أَعْبُدُ مُخْلِصاً لَّهُ دِيْنِيْ ۔فَاعْبُدُوا مَا شِئْتُم مِّن دُونِه (الزمر: ۱۴۔۱۵)

''تو کہہ: میں تو اللہ کو پوجتا ہوں خالص کر کے اپنی بندگی اس کے واسطے، اب تم پوجو جس کو چاہو اس کے سوا''۔

ایک اور جگہ اس کا ارشاد ہے:

وَإِن كَذَّبُوكَ فَقُل لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ أَنتُمْ بَرِيْئُونَ مِمَّا أَعْمَلُ وَأَنَابَرِيءٌمِّمَّاتَعْمَلُون (سورہ یونس:۴۱)

''اور اگر تجھ کو جھٹلائیں تو کہہ میرے لیے میرا کام اور تمہارے لیے تمہارا کام، تم پر ذمہ نہیں میرے کام کا اور مجھ پر ذمہ نہیں جو تم کرتے ہو''۔

ان آیات کی روشنی میں یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ اسلام نے

انسانوں کو مذہب اختیار کرنے کے سلسلے میں آزاد رکھا ہے۔ وہ چاہیں تو اسلام قبول کر کے دنیا و آخرت کی سعادت حاصل کریں اور اگر اسے نہ قبول کرنا چاہیں تو انہیں اس بات کا بھی پورا اختیار ہے۔

پرسنل لا پر عمل کرنے کی آزادی

اسلامی ریاست میں غیر مسلم شہری اپنے پرسنل لا پر عمل کرنے میں آزاد ہیں۔ اس سلسلے میں ان پر کسی طرح کی پابندی عائد نہیں ہے۔ عہد رسالت میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ ایک مثال محرمات سے نکاح کی ہے۔ اگر کوئی مسلمان محرمات میں سے کسی عورت سے نکاح کرے تو وہ اسلامی قوانین کے مطابق سزا کا مستحق ہوگا لیکن اگر دوسرے مذاہب کے لوگ ایسا کریں اور ان کے مذہب میں ایسا کرنے کی اجازت ہو تو اسلامی ریاست میں ان پر کسی طرح کی پابندی عائد نہ ہوگی۔ حضورؐ کے زمانہ میں مجوس سگی بہنوں سے شادی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ساتھ دو بہنوں، نیز خالہ بھانجی اور پھوپھی بھتیجی کو بیک وقت نکاح میں جمع کرتے تھے۔ لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین کے مجوسیوں سے اس معاملہ میں کوئی تعرض نہیں کیا۔[۱۰] اسی طرح اگر وہ مہر اور گواہ کے بغیر اپنے یہاں شادی کو جائز قرار دیتے ہوں اور عدت کی پابندی نہ کرتے ہوں تو اسلامی ریاست انہیں اس کی پوری اجازت فراہم کرے گی اور ان کے معاملہ میں اس کو دخل اندازی کا قطعی حق نہ ہوگا۔[۱۱]

فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو اپنے مذہب پر عمل کی آزادی یہاں تک حاصل ہوگی کہ ان پر شراب اور سور کے استعمال کی کسی طرح کی پابندی نہیں عائد کی جائے گی، جب کہ اسلام میں مذکورہ دونوں چیزیں حرام ہیں، ان کا استعمال کرنا جرم عظیم ہے۔ جب اسلام انہیں غیر اللہ کی پرستش کی اجازت دیتا ہے تو ان کو سود اور شراب کے استعمال سے کس طرح روکا جاسکتا ہے۔ صاحب ہدایہ نے ایک اصول یہ بیان کیا ہے:

و نحن أمرنا أن نترکھم و ما یعتقدون۔ ۱۲؎

''ہم کو حکم دیا گیا ہے کہ ہم غیر مسلموں کو آزاد چھوڑ دیں کہ وہ اپنے عقیدے اور مذہب پر جس طرح چاہیں، عمل کریں''۔

علامہ طبریؒ نے لکھا ہے:

لا یغیرون عن ملۃ و لا یحال بینھم و بین شرائعھم۔ ۱۳؎

''انہیں ان کے مذہب کے کسی طریقے کو بدلنے کو نہیں کہا جائے گا، نہ اپنی شریعت پر عمل کے معاملہ میں ان کے سامنے کسی طرح کی رکاوٹ کھڑی کی جائے گی''۔

مذکورہ شواہد کی روشنی میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اسلام نے غیر مسلموں کو عقیدے کی آزادی کے ساتھ مذہب پر عمل کرنے کی بھی پوری چھوٹ دی ہے۔ایک مثالی فلاحی ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے تمام شہریوں کے حقوق کا تحفظ کرے۔ البتہ اس سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مذہبی مراسم اور شعائر کو پبلک میں اعلان واظہار کے ساتھ ادا کرنے کے متعلق اسلامی قانون یہ ہے کہ اہل ذمہ اپنی بستیوں میں تو ان کو پوری آزادی کے ساتھ کرسکیں گے، البتہ خالص مسلم آبادیوں میں اسلامی حکومت کو اختیار ہوگا کہ ان پر پابندی عائد کردے۔

علامہ کاسانیؒ نے لکھا ہے:

لا یمنعون من اظھار شیء مما ذکرنا من بیع الخمر و الخنزیر و اخراج الصلیب و ضرب الناقوس فی قریۃ أو موضع لیس من امصار المسلمین و لو کان فیہ عدد کثیر من أھل الاسلام، و انما یکرہ ذلک فی أمصار المسلمین، و ھی التی یقام فیھا الجمع و الاعیاد و الحدود و اما اظھار فسق یعتقدون حرمتہ کالزنا و سائر الفواحش التی حرام فی دینھم فانھم یمنعون من ذلک سواء کانوا فی أمصار المسلمین أو فی امصارھم۔ ۱۴؎

''جو بستیاں 'امصار المسلمین' میں سے نہیں ہیں ان میں ذمیوں کو شراب

وخنزیر بیچنے، صلیب نکالنے اور ناقوس بجانے سے نہیں روکا جائے گا، خواہ وہاں مسلمانوں کی کتنی ہی کثیر آبادی ہو، البتہ یہ افعال 'امصار المسلمین' میں ناپسندیدہ ہیں، یعنی ان شہروں میں جنہیں جمعہ وعیدین اور اقامت حدود کے لیے مخصوص کیا گیا ہو۔ رہا وہ فسق جس کی حرمت کے خود وہ بھی قائل ہیں، مثلاً زنا اور دوسرے تمام فواحش، جو ان کے مذہب میں بھی حرام ہیں تو اس کے علانیہ ارتکاب سے ان کو ہر حال میں روکا جائے گا، خواہ وہ امصار المسلمین میں ہوں یا خود اپنے شہروں میں''۔

معبودانِ باطل کو برا بھلا کہنے کی ممانعت

یہ نکتہ بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ غیر مسلم جن معبودوں کی عبادت کرتے ہیں، مسلمانوں کے لیے ان کو برا کہنا اور ان پر سبّ وشتم کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ مسلمانوں کو صرف پیغامِ اسلام کی تبلیغ واشاعت کا حکم دیا گیا ہے، دوسرے مذاہب کے معبودوں کی تذلیل وتوہین کرنے کی انہیں اجازت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَن (العنکبوت: ۴۶)

''اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر اس طریقے سے جو بہتر ہے''۔

آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو غیر مسلموں کے معبودوں پر کیچڑ اچھالنے اور ان کی توہین وتذلیل کرنے کی اجازت نہیں دی ہے، بلکہ اپنی بات کو احسن طریقے سے پیش کرنے پر زور دیا ہے۔ دوسری جگہ صراحت سے مخالفین کے معبودوں پر سبّ وشتم کرنے سے منع کیا گیا ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِم مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (الانعام: ۱۰۸)

''یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں تم انہیں برا بھلا نہ کہو کہ وہ حد سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہنے لگیں۔ اسی طرح ہم نے ہر گروہ کے لیے اس کا عمل خوش نما بنا دیا ہے۔ پھر انہیں اپنے رب کے

پاس لوٹنا ہے، جو انہیں بتادے گا کہ وہ کیا کررہے تھے“۔
علامہ ابن العربیؒ نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:
اتفق العلماء علی أن معنی الآیة لاتسبوا آلهة الکفار فیسبوا الٰهکم، فمنع اللّٰہ تعالیٰ فی کتابه أحداً ان یفعل فعلاً جائزاً یؤدی الی محظور، ولأجل هذا تعلّق علماؤنا بهذه الآیة فی سدّ الذرائع۱۵؎
”علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ کفار کے معبودوں کو برا بھلا نہ کہو، کیوں کہ پھر وہ تمہارے معبود کو گالم گلوچ کریں گے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں منع کیا ہے ہر ایسا کام کرنے سے جو بذات خود جائز ہو، مگر کسی گناہ کی طرف لے جاتا ہو۔ اسی وجہ سے علماء نے اس آیت کو سدِّ ذرائع میں شامل کیا ہے‘۔
مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں:
”یہ نصیحت نبیؐ کے پیروؤں کو کی گئی ہے کہ وہ اپنی تبلیغ کے جوش میں اتنے بے قابو نہ ہوجائیں کہ مناظرے اور بحث وتکرار سے معاملہ بڑھتے بڑھتے غیر مسلموں کے عقائد پر حملہ کرنے اور ان کے پیشواؤں اور معبودوں کو گالیاں دینے تک نوبت پہنچ جائے، کیوں کہ یہ چیز ان کو حق سے قریب لانے کے بجائے اور زیادہ دور پھینک دے گی“۔۱۶؎

غیر مسلموں کو اسلام کے بارے میں جاننے کی اجازت

دنیا کا یہ اصول ہے کہ دوران جنگ اگر کوئی مخالف مذہب کا شخص کسی قوم کے ہاتھوں لگ جائے تو اسے کسی طرح کی امان حاصل نہیں ہوسکتی، مگر اسلام نے اس سلسلہ میں رواداری اور حسن سلوک کا جو معاملہ کیا ہے وہ انتہائی اہم اور مبنی بر عدل ہے۔ اسلام نے حکم دیا ہے کہ کوئی غیر مسلم اسلام کے متعلق کچھ جاننا چاہے تو اسے اس کا موقع فراہم کیا جانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ

ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُونَ (التوبۃ:۶)

''اگر کوئی مشرک تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دے، یہاں تک کہ وہ سن لے کلام اللہ کو، پھر پہنچا دے اس کو اس کی امن کی جگہ۔ یہ اس واسطہ کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے''۔

اس آیت کی تشریح میں علامہ ابوبکر جصاص رازیؒ نے لکھا ہے:

'اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ حربی جب ہم سے امان طلب کرے تو اسے امان دینا جائز ہے، تاکہ وہ اسلام کی صحت اور صداقت کے دلائل سن سکے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا قول ''اگر تم سے پناہ کا دخواست گار ہو'' کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ تم سے طالبِ امن ہو اور اللہ تعالیٰ کے قول ''پس اسے پناہ دو'' کے معنی یہ ہیں کہ اسے امن دو، تاکہ وہ اللہ کا کلام سن لے، جس میں صحتِ توحید اور صحتِ نبوت کی دلیلیں ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر کوئی کافر توحید اور نبوت کے بارے میں دلیل و برہان کا مطالبہ کرے تو ہمارے لیے اس کو قتل کر دینا ناجائز ہے، جب کہ اس سلسلے میں وہ ہم سے طالبِ امن ہو، سوا اس صورت کے کہ ہم دلیلیں بیان کر دیں اور حجت قائم کر دیں۔ کیوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ امان دیں، یہاں تک کہ وہ کلام الٰہی سن لے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اگر کوئی ہم سے امورِ دین کی تعریف و تبیین چاہے تو ہم اسے تعلیم دیں، اس لیے کہ وہ کافر ہمارے پاس اس لیے پناہ گزیں ہوا ہے کہ دین کی صحیح معرفت حاصل کرے''۔ ۱۷؎

قرطبی نے اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے:

ظاهر الآية إنما هي من يريد سماع القرآن والنظر في الاسلام فأما الجارة لغير ذلك فإنما هي لمصلحة المسلمين والنظر في ماتعدد عليهم به منفعة۔ ۱۸؎

''آیت کا تعلق بظاہر اس شخص سے ہے جو قرآن مجید کو سننا اور اسلام پر

غور وفکر کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ جہاں تک کسی اور مقصد سے امان فراہم کرنے کا تعلق ہے تو اس میں مسلمانوں کے مفادات کو سامنے رکھا جائے گا''۔

شرح السیر الکبیر میں ہے:

'اذا قال الحربی او الذمی للمسلم علّمنی القرآن، فلا بأس بأن یعلّمه و یفقّهه فی الدین، لعل الله یقلب قلبه۔[۱۹]

''اگر حربی یا ذمی مسلمان سے کہے کہ مجھ کو قرآن کی تعلیم دو تو کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اس کو اس کی تعلیم دے اور اس کے اندر دین کی سمجھ پیدا کرے۔ ممکن ہے کہ اس طرح اللہ اس کے دل کو پلٹ دے''۔ (یعنی وہ مسلمان ہو جائے)

تفصیل بالا کی روشنی میں چند باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں:

۱۔ اسلامی ریاست میں حالت جنگ میں بھی، دشمن کے لیے آمد و رفت، تعلیم، تجارت اور سفارت جیسی سرگرمیوں کے لیے دروازے کھلے رکھنا چاہئیں، تاکہ ان کے افراد بھی اسلام کی تعلیم اور مسلمانوں کے عام رویہ کو جان سکیں۔

۲۔ محارب قوم کا کوئی فرد اللہ کی کتاب اور اس کے احکام کو سمجھنا چاہے تو اسے اس کا موقع دیا جائے گا، تاکہ وہ اسلامی تعلیمات کا اطمینان سے مطالعہ کر سکے۔ اس سلسلے میں اسے ہر طرح کی سہولیات فراہم کی جائیں گی، مگر اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ کیوں کہ یہ اسلام کی اصولِ آزادی کی خلاف ہے۔

۳۔ محارب قوم کا کوئی شخص قرآن مجید اور اس کی تعلیمات کو سمجھنے کے علاوہ کسی اور مقصد سے بھی اسلامی ریاست میں آنا چاہے تو اسے آنے کی اجازت دی جائے گی اور وہ محفوظ و مامون رہے گا۔ ضرورت کی تکمیل ہوتے ہی اسے اس کے مقام پر بحفاظت پہنچا دیا جائے گا۔

۴۔ محارب قوم کے فرد کو اسلام پر غور وفکر کرنے کی پوری اجازت حاصل ہوگی۔ اسلام کو قبول کرنے کے سلسلہ میں اس سے کسی طرح کی جلد بازی کا مطالبہ نہیں

کیا جائے گا، جیسا کہ حضرت ثمامہ بن اثال کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے انہیں تین دن تک باندھے رکھا، اس کے بعد آزاد کر دیا۔

عبادت گاہوں کا تحفظ

اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے معابد محفوظ رہیں گے۔ ان سے کسی طرح کا تعرض نہیں کیا جائے گا۔ اگر کوئی ظالم وجابر ایسا کرتا ہے تو وہ اللہ کے فرمان کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ مختلف مذاہب کے عبادت خانوں کی حفاظت کے لیے حسب ضرورت تلوار بھی اٹھائی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوٰمِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوٰتٌ وَمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا وَلَيَنصُرَنَّ اللّٰهُ مَن يَنصُرُهُ إِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ (الحج:۴۰)

''اگر اللہ لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو خانقاہیں، گرجے، عبادت گاہیں اور مساجد، جن میں اللہ کا نام بہ کثرت لیا جاتا ہے، سب منہدم کر دیے جاتے اور اللہ ضرور مدد کرے گا ان لوگوں کی جو اس کی مدد کرتے ہیں، بے شک اللہ طاقت ور اور غالب ہے''۔

'صومعہ' کی جمع 'صوامع' ہے۔ اس سے مراد عام راہبوں اور سنیاسیوں کی خانقاہیں ہیں۔ 'بیعہ' کی جمع 'بیع' ہے۔ اس سے مراد عیسائیوں کے گرجے ہیں۔ 'صلوۃ' کی جمع 'صلوات' ہے۔ اس سے مراد یہود کے عبادت خانے اور ان کے کنیسے ہیں اور مسجد کی جمع مساجد ہے۔ اس سے مراد اہلِ اسلام کی عبادت گاہیں ہیں۔ ۲۰ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد کا حکم صرف مسلمانوں ہی کو نہیں دیا گیا ہے، بلکہ ظلم و بربریت کو مٹانے کے لیے اس کا حکم دوسرے انبیاء اور ان کی امتوں کو بھی دیا جاتا رہا ہے۔ اگر یہ حکم نہ ہوتا تو دنیا میں ظلم وستم عام ہو جاتا اور عبادت گاہیں تک محفوظ نہ رہتیں۔ اللہ کے دشمن انہیں بھی مسمار کر کے رکھ دیتے۔ اس لیے جب بھی ظلم نے حد سے تجاوز کیا اور ظالموں نے ادیان و مذاہب کی نشانیوں کو ملیامیٹ کر دینا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے اہل

حق کو ان کی سرکوبی کے لیے کھڑا کیا ہے اور ان کے ذریعہ اس طرح ظلم کے بڑھتے قدم روک دیے ہیں۔ ۲۱؎

اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ ظلم و جور، جو مشرکین کی جانب سے مسلمانوں پر ہو رہا تھا، اگر اہل ایمان کو اس کے خلاف تلوار اٹھانے کی اجازت نہ ہوتی تو زمین پر کوئی بھی عبادت گاہ باقی نہ رہتی۔ یہودیوں کے معبد، نصاریٰ کے گرجے اور خانقاہیں اور مسلمانوں کی مساجد سب منہدم کردی جاتیں۔ ۲۲؎

ان میں سے کوئی بھی مفہوم مراد لیا جائے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عبادت گاہوں کو مسمار کرنا، اسلام کے نزدیک سراسر ظالمانہ رویہ ہے۔ اسلام کی تعلیمات سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی حفاظت اسی طرح ہونی چاہیے جس طرح مساجد کی ہوتی ہے۔ فقہاء نے صراحت کی ہے کہ مسلمان جن شہروں کو فتح کریں، ان میں غیر مسلموں کی عبادت گاہیں باقی رہیں گی، ان سے تعرض نہیں کیا جائے گا۔ ابن قدامہؒ فرماتے ہیں:

أيّما مصّر مصرته العجم ففتحه الله على العرب فنزلوه فان للعجم مافي عهدهم۔ ۲۳؎

"جس شہر کو عجم نے آباد کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے عربوں کو اس پر فتح نصیب کی اور وہ وہاں پہنچے تو عجم کی وہ چیزیں باقی رہیں گی جو ان کے عہد میں تھیں"۔

علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ "ذمیوں کے کلیسا، ان کی عبادت گاہیں اور ان کے آتش کدے مسمار نہیں کیے جائیں گے"۔ ۲۴؎

غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کے تحفظ کے سلسلے میں عہد رسالت میں متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ھ میں عیسائیوں سے معاہدہ کیا تھا، جس کی رو سے ان کو تمام حقوق فراہم کرنے کے ساتھ ان کے عبادت خانوں کو بھی

تحفظ فراہم کیا تھا اور مذہبی امور انجام دینے کی انھیں اجازت دی تھی۔ معاہدہ کا متن درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، من محمد النبی الی الأسقف الحارث وألساقفة نجران وکفتهم ورهبانهم وأهل بیتهم ورفیقهم وملّتهم ومواطنهم وعلی کل ماتحت أیدیهم من قلیل و کثیر جوار اللہ ورسوله، لایغیر أسقف من سقفیة ولا راهب من رهبانیة ولا کاهن من کهانیة ولا یغیر حق من حقوقهم ولا سلطانهم ولا مما کانوا علیه، علی ذلک جوار اللہ ورسوله أبداً۔ ۲۵

'محمد کی طرف سے اسقف ابو حارث اور نجران کے دوسرے پادریوں اور راہبوں، ان کے رفیقوں، اہل بیت اور غلاموں کو یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ عبادت گاہوں اور خانقاہوں میں ہر ایک چھوٹی بڑی چیز جیسی تھی، ویسی ہی رہے گی۔ اللہ اور اس کے رسول نے یہ عہد کیا کہ نہ کوئی بشپ اپنے عہدے سے نہ کوئی راہب اپنی خانقاہ سے اور نہ کوئی پادری اپنے منصب سے خارج کیا جائے گا اور نہ ان کے اختیارات، حقوق اور معمول میں کسی قسم کا تغیر ہونے پائے گا۔ یہ ہمیشہ کے لیے اللہ اور اس کے رسول کا عہد ہے'۔

کتب تاریخ میں ایک اور معاہدہ کا ذکر ہے، جو آپؐ نے ۶۲۳ء میں سینٹ کیتھرائن سے کیا تھا۔ اس کی رو سے راہبوں اور تمام عیسائیوں کو مذہبی آزادی، عبادت گاہوں کا تحفظ اور دیگر تمام حقوق عطا کیے گئے تھے۔

نئی عبادت گاہوں کی تعمیر

البتہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اسلامی ریاست میں جن شہروں کو مسلمانوں نے آباد کیا ہے وہاں غیر مسلم اپنی عبادت گاہیں تعمیر نہیں کرسکتے۔ اسی طرح جن شہروں کو مسلمانوں کے تہذیبی مراکز کی حیثیت سے جانا جاتا ہے، ان میں بھی غیر مسلموں کو نئی عبادت گاہیں تعمیر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ البتہ جن بستیوں میں خاص کر ذمیوں کی

آبادیاں ہوں، وہاں وہ اپنی عبادت گاہیں تعمیر کرسکتے ہیں۔۲۶؎ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کسی علاقے کے لوگوں کی اسلامی ریاست سے اس بات پر صلح ہوجائے کہ پورے علاقے پر یا اس کے ایک حصہ پر قبضہ ان کا رہے گا اور وہ خراج ادا کریں گے تو صلح کے مطابق زمین ان کی ہوگی اور وہ اس میں اپنی عبادت گاہیں اور گرجے تعمیر کرسکتے ہیں۔۲۷؎

ان آثار و شواہد سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی ریاست میں غیرمسلموں کے معابد باقی رہیں گے، ان سے کسی طرح کا تعرض نہیں کیا جائے گا۔ اگر ان کی مرمت کی ضرورت ہے تو انہیں اس کی اجازت ہوگی، کیوں کہ یہ ان کا آئینی حق ہے اور اسلام اس معاملہ میں کسی طرح کی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا۔

فقہاء نے جو احکام بیان کیے ہیں، ان کی کچھ نہ کچھ سیاسی مصالح رہی ہوں گی، اس لیے انہوں نے نئے معابد تعمیر کرنے کی عمومی اجازت نہیں دی۔ البتہ قرآن و حدیث میں واضح طور پر کہیں اس سے منع نہیں کیا گیا ہے، اس لیے میرے خیال میں غیرمسلموں کو نئے معابد تعمیر کرنے کی بھی اجازت ہونی چاہیے۔

غیرمسلموں کا مذہبی مقامات میں داخلہ

اس سلسلہ میں بعض اور سوالات بھی پیدا ہوتے ہیں: ایک یہ کہ کیا غیرمسلم یا مشرک حدود حرم میں داخل ہوسکتا ہے؟ دوسرا یہ کہ کیا غیرمسلم مسجد میں داخل ہوسکتا ہے؟ اور تیسرا سوال یہ کہ کیا مسلمان غیرمسلم کے عبادت خانے میں نماز پڑھ سکتا ہے؟

جو حضرات ان سوالات کا جواب نفی میں دیتے ہیں وہ قرآن کریم کی درج ذیل آیت پیش کرتے ہیں:

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلاَيَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَـذَا۔ (التوبۃ:۲۸)

''اے ایمان والو! مشرک نجس ہیں، لہٰذا اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب نہ آنے پائیں''۔

لیکن فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اس آیت میں نجاست سے مراد اعتقادی نجاست ہے، اس کا جسمانی نجاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ علامہ جصاصؒ فرماتے ہیں:

'اطلاق اسم النجس علی المشرک من جهة أن الشرک الذی یعتقده یجب اجتنابه کما یجب اجتناب النجاسات و الأقدار فلذلک سمّاهم نجساً۔ ۲۸

''مشرک پر اسم نجس کا اطلاق اس پہلو سے ہے کہ شرک سے، جس پر اس کا عقیدہ ہے، اسی طرح اجتناب ضروری ہے جس طرح نجاسات اور گندگیوں سے پرہیز کرنا لازمی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں نجس کہا ہے''۔

علامہ شوکانیؒ نے لکھا ہے:

و ذهب الجمهور من السلف و الخلف و منهم أهل المذاهب الأربعة الی أن الکافر لیس بنجس الذات، لأن الله سبحانه أحلّ طعامهم و ثبت عن النبی صی الله علیه و سلم فی ذلک من فعله و قوله ما یفید عدم نجاسة ذواتهم، فأکل فی آنیتهم و شرب منها و توضأ فیها و أنزلهم فی مسجده۔ ۲۹

''جمہور سلف و خلف اور ائمہ اربعہ کا مسلک یہ ہے کہ کافر اپنی ذات میں نجس نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کھانے حلال کیے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل سے ثابت ہے کہ وہ اپنی ذات میں نجس نہیں ہیں۔ آپؐ نے ان کے برتنوں میں کھایا ہے، ان میں پیا ہے، ان سے وضو کیا ہے اور انہیں اپنی مسجد میں قیام کرایا ہے''۔

امام نوویؒ نے شرح مسلم میں لکھا ہے:

أما الکافر فحکمه فی الطهارة و النجاسة حکم المسلم، هذا مذهبنا و مذهب الجماهیر من السلف و الخلف، و أما قول الله عز

وجل ''إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ'' فالمراد نجاسة الإعتقاد والاستقذار وليس المراد أن أعضائهم نجسة كنجاسة البول والغائط ونحوهما، فإذا ثبت طهارة الآدمی، مسلماً كان او كافراً، فعرقه ولعابه ودمعه طاهرات، سواء كان محدثاً او جنباً او حائضاً او نفساء، وهذا كله باجماع المسلمين۔۳۰؎

''کافر کا حکم بھی پاکی اور ناپاکی کے معاملہ میں مسلم جیسا ہے۔ یہی ہمارا (شوافع) اور جمہور سلف وخلف کا مسلک ہے۔ اللہ کے ارشاد'' مشرک ناپاک ہیں'' سے اعتقاد کی نجاست اور گندگی مراد ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے اعضائے جسم پیشاب پاخانے کی طرح ناپاک ہیں۔ جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ آدمی پاک ہے، چاہے وہ مسلمان ہو یا کافر، تو اس کا پسینہ، لعاب اور آنسو بھی پاک ہیں، خواہ وہ بے وضو ہو یا جنابت کی حالت میں ہو یا عورت حیض یا نفاس کی حالت میں ہو۔ ان باتوں پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے''۔

اس سے معلوم ہوا کہ مشرک کا مسجد میں داخل ہونا ممنوع نہیں ہے۔ اس کی تائید عہد نبوی کے متعدد واقعات سے ہوتی ہے۔ وفد ثقیف کا واقعہ مشہور ہے۔ جب وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان کے لیے مسجد میں ایک خیمہ نصب کرایا۔ لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ تو نجس لوگ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: یہ لوگ ظاہری طور پر ناپاک نہیں ہیں، بلکہ ان کا اندرون گندا ہے۔۳۱؎

غیر مسلموں کو مساجد میں عبادت کرنے کی اجازت

جب اس مسئلہ کی وضاحت ہوگئی کہ غیر مسلموں کو مسجد میں داخل ہونے کی اجازت ہے تو کیا وہ ان میں اپنی عبادت کر سکتے ہیں؟ اس سلسلہ میں کتب سیرت و حدیث سے یہ رہ نمائی ملتی ہے کہ نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے اسے مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور انہیں اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

نصاریٰ کا وفد جب آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا، اس وقت آپؐ مسجد میں تشریف رکھتے تھے۔ یہ لوگ بہت عمدہ لباس سے آراستہ تھے۔ بعض صحابہ، جنہوں نے ان کو دیکھا تھا، فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کے بعد کوئی ایسا گروہ نہیں دیکھا۔ جس وقت یہ لوگ پہنچے، آپؐ عصر کی نماز پڑھ کر بیٹھے تھے۔ ان کی عبادت کا وقت آیا تو وہ مسجد ہی میں عبادت کرنے لگے۔ آپؐ نے فرمایا: ''ان کو عبادت کرنے دو، کچھ نہ کہو''۔ چنانچہ ان لوگوں نے مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔

پتہ چلا کہ شریعت اسلامیہ نے غیر مسلم یا اہل کتاب کو مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بتا دینا بھی مناسب ہوگا کہ مسلمان بھی کنیسہ یا گرجا وغیرہ میں نماز پڑھ سکتا ہے۔ کیوں کہ اسلام دیگر مذاہب کی عبادت گاہوں کو عبادت گاہ کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے۔ اس لیے کہ ان میں کسی نہ کسی حیثیت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے: ''تجوز الصلوٰۃ فی الکنیسۃ''۔ ۳۳؎

> ''عیسائیوں اور یہودیوں کی عبادت گاہ میں مسلمان نماز پڑھ سکتے ہیں''۔

غیر مسلم کا داخلہ حدودِ حرم میں

اس سلسلے میں ایک سوال یہ کیا جاتا ہے کہ کیا غیر مسلم کا داخلہ حدود حرم میں ہوسکتا ہے؟ اس مسئلہ میں فقہاء کی دو آراء ہیں: ایک رائے تو یہ ہے کہ سورۂ توبہ آیت نمبر ۲۸ میں مشرکین کے مسجد حرام میں داخلہ کی ممانعت ہے، البتہ حدود حرم میں وہ داخل ہوسکتے ہیں۔ دوسری رائے یہ ہے کہ حدودِ حرم میں بھی انہیں داخلہ کی اجازت نہیں ہے، ۳۴؎

حنابلہ کہتے ہیں کہ مسجد حرام میں غیر مسلموں کے داخلہ کی اجازت نہیں۔ اسی کے حکم میں حدود حرم بھی آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی دلیل میں سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت کا حوالہ پیش کیا ہے، جس میں معراج کا ذکر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ غیر مسلم حدودِ حرم میں داخل ہونا چاہے تو اسلامی ریاست اسے منع کرے گی۔ تاجروں اور سفیروں کو بھی اس کی اجازت نہ ہوگی۔ اگر کسی غیر مسلم کے ساتھ سامانِ تجارت اور غلہ ہے تو وہ حرم سے باہر قیام کرے گا۔ جو لوگ خریدنا چاہیں گے، وہاں پہنچ کر خرید لیں گے۔ اسی طرح غیر مسلم سفیر اپنا پیغام مسلمانوں کے ذریعہ پہنچائے گا اور ضرورت پڑنے پر حاکم اس سے حدودِ حرام سے باہر آکر ملاقات کرے گا۔ وہ عمداً حدودِ حرم میں داخل ہو تو اس کی تعزیر ہوگی اور اگر ناواقفیت کی وجہ سے ایسا کرے تو تنبیہ ہوگی۔ ۳۵؎

احناف کا مسلک یہ ہے کہ قرآن کی مذکورہ آیت میں ممانعت کا تعلق حج سے ہے۔ ایام حج میں غیر مسلم کا داخلہ خانۂ کعبہ اور مقاماتِ حج میں ممنوع ہے، دوسرے ایام میں یہ ممانعت ختم ہوجاتی ہے۔ غیر مسلم مسجد حرام اور مقاماتِ حج پر جاسکتا ہے، البتہ وہ اسے وطن نہیں بنا سکتا۔ ہاں، وقت ضرورت آمد و رفت کرسکتا ہے۔ جہاں تک دیگر مساجد کا معاملہ ہے تو اس کے سلسلہ میں اس طرح کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ ۳۶؎

غیر مسلموں کے تہوار

کسی بھی قوم کے تہوار اور جلسے جلوس اس کی تہذیبی شناخت ہوتے ہیں۔ ان کو منانا ان کی معاشرتی زندگی کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنے تہواروں کی رسوم بہ خوشی ادا کریں۔ ایک فلاحی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی رعایا کو ان کے مذاہب کے مطابق زندگی گزارنے کا انتظام و انصرام کرے۔ چنانچہ امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں لکھا ہے:

وعلی أن یضربوا نواقیسھم فی أی ساعۃ شاءوا من لیل أو نھار الا فی أوقات الصلوات، علی أن یخرجوا الصلیب فی أیام عیدھم۔ ۳۷

''اسلامی ریاست کے غیر مسلموں کو آزادی ہے کہ نماز کے اوقات کے علاوہ رات اور دن میں جس وقت چاہیں اپنے سنگھ بجائیں۔ اسی طرح انہیں تہوار کے مواقع پر صلیب اٹھانے کی پوری آزادی ہوگی''۔

فقہاء نے اوقاتِ نماز کی قید اس لیے لگائی ہے تا کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان ٹکراؤ نہ ہو اور ملک میں امن و امان کی فضا استوار رہے۔ جب تک اسلامی ریاست میں مختلف طبقات کے درمیان مودت ومحبت قائم نہیں ہوگی، اس وقت تک غیر مسلم اقلیتیں پرسکون زندگی نہیں گزار سکتیں۔

☆☆☆

حواشی ومراجع

۱۔ ابن قیم الجوزیہ، ہدایۃ الحیاری فی أجوبۃ الیہود والنصاری، مؤسسۃ مکۃ للطباعۃ والاعلام، بدون سنہ، ج:۱، ص:۱۲

۲۔ ابن کثیر الدمشقی، تفسیر القرآن العظیم، المکتبہ التجاریہ الکبری مصر، ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۷ئ۔ ج:۱، ص:۳۰۱

۳۔ زمخشری، ابوالقاسم جار اللہ محمود بن عمر، الکشاف عن حقائق التنزیل، طبع مصر ۱۹۷۲ئ/ ۱۳۹۲ھ، تحقیق محمد قمحاوی، ج:۱، ص:۳۸۷

۴۔ مودودی، سید ابوالاعلی، اسلامی ریاست، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی ۱۹۹۹ئ، مرتب پروفیسر خورشید احمد، ص:۵۶۷،

۵۔ طبری، ابوجعفر محمد بن جریر طبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن، المطبعۃ المیمنیۃ مصر، ج:۳، ص:۹۔۱۰

۶۔ کشاف، ج:۱، ص:۳۸۷

۷۔ ترجمہ شیخ الہند، تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانی، ص:۲۹۰۔۲۹۱

۸۔ مودودی، ابوالاعلی: تفہیم القرآن، مطبع مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی، دہلی، ۱۹۷۰ء، ج:۱، ص: ۳۱۳

۹۔ آزاد، مولانا ابوالکلام، ترجمان القرآن، ساہتیہ اکادمی دہلی، ج:۲، ص:۲۳۲
۱۰۔ ابو یوسف، قاضی، یعقوب بن ابراہیم، کتاب الخراج، طبع قاہرہ، ۱۳۵۲ھ، ص:۱۳۰،
۱۱۔ سرخسی، شمس الائمہ محمد بن احمد، المبسوط، مطبعۃ السعادۃ مصر، ۱۳۲۴ھ، ج:۹، ص:۵۶،
۱۲۔ مرغینانی، برہان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر، ہدایہ، کتب خانہ رشیدیہ، دہلی، ج:۳، ص:۸۶،
۱۳۔ طبری، ابوجعفر، محمد بن جریر، تاریخ الرسل والملوک، دار المعارف مصر، ج:۴، ص:۱۳۷
۱۴۔ بدائع الصنائع، ج:۷، ص:۱۱۳۔ خالص اسلامی آبادیوں سے مراد وہ مقامات ہیں جو اصطلاح شرع میں 'امصار المسلمین' کہلاتے ہیں۔ اس لفظ کا اطلاق صرف ان مقامات پر ہوتا ہے جن کی زمین مسلمانوں کی ملکیت ہو اور جن کو مسلمانوں نے اظہارِ شعایرِ اسلام کے لیے مخصوص کرلیا ہو۔ (مودودی، اسلامی ریاست، ص:۵۸۸)
۱۵۔ ابن العربی، ابوبکر محمد بن عبداللہ، احکام القرآن، ج:۲، مطبع البابی الحلبی، ۱۹۶۷ئ، ص:۷۳۵۔ ۷۳۶
۱۶۔ تفہیم القرآن، ج:۱، ص:۵۷۱
۱۷۔ جصاص، ابوبکر احمد بن علی الرازی الحنفی، احکام القرآن، طبع مصر ۱۳۴۷ھ ج:۳، ص:۱۰۳۔ ۱۰۴
۱۸۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ج:۸، ص:۷۶
۱۹۔ شرح السیر الکبیر، ج:۱، ص:۳۸۔۱۳۹
۲۰۔ طبری، جامع البیان، ج:۱۷، ص:۱۱۴۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ایک تفسیر میں اس کے برعکس 'بیع' سے یہود کی عبادت گاہیں اور صلوات سے نصاریٰ کے کنیسے مراد لیے گئے ہیں۔
۲۱۔ قرطبی، الجامع الاحکام القرآن، ج:۱۳، ص:۷۰۔ اسی سے ملتی جلتی بات ابن قیمؒ نے اَحکام اَھل الذمۃ (ج:۲، ص:۶۶۸) میں لکھی ہے۔
۲۲۔ ماوردی، النکت والعیون، ج:۳، ص:۸۴
۲۳۔ ابن قدامہ، المغنی، ج:۱۳، ص:۲۴۰
۲۴۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ج:۱۲، ص:۷۰
۲۵۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ للعہد النبوی والخلافۃ الراشدۃ، دار الارشاد، بیروت، ۱۳۸۹ھ، ص ۱۴۵،
۲۶۔ ابن قدامہ المقدسی، المغنی علی مختصر الخرقی، تحقیق الدکتور عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی، الدکتور عبدالفتاح، محمد الحلو، ج:۱۳، طبع مصر، ۱۹۹۲ئ، ۱۳۱۴ھ، ص:۲۳۹۔ ۲۴۰۔
۲۷۔ حوالۂ سابق، ص:۲۴۰
۲۸۔ جصاص، اَحکام القرآن، ج:۳، ص:۱۰۸
۲۹۔ شوکانی، محمد بن علی،، فتح القدیر الجامع بین فنی الروایۃ والدرایۃ من علم التفسیر، تحقیق احمد عبدالسلام،

طبع بیروت، ۱۹۹۴ئ/ ۱۴۱۵ھ، ج:۲، ص:۴۴۶،
۳۰۔ نووی، محی الدین ابوزکریا یحییٰ، شرح مسلم، طبع دارالریان للتراث قاہرہ، ۱۹۸۷ئ/ ۱۴۰۷ھ، ج:۲، جز ۴ئ، ص:۶۶
۳۱۔ جصاص، أحکام القرآن، ج:۳، ص:۲۵۳
۳۲۔ سیرۃ النبی، دوم، ص:۳۷۵
۳۳۔ مختصر الفتاویٰ لابن تیمیۃ مطبوعہ مصر، ص:۶۵
۳۴۔ شوکانی، فتح القدیر، ج:۲، ص:۴۴۶
۳۵۔ ابن قدامہ، المغنی، ج:۱۳، ص:۲۴۵۔۲۴۶
۳۶۔ زمخشری، الکشاف، ج:۲، ص:۱۸۳

اسلام کی دعوت

مولانا سید جلال الدین عمری

رسول کی تعریف اور اس کی ذمہ داریاں، حضرت محمد مصطفی ﷺ کا عظیم کارنامۂ دعوت، مباحثِ دعوت، دعوت اور اتباع، دعوت و اصلاح کی ترتیب، دعوت کے اصول و آداب، انکار دین کے اسباب، دعوت کے لیے ضروری اوصاف (ایمان باللہ، ایمان بالآخرۃ، نماز، زکوۃ، اخلاص اور استقامت) دعوت اور تنظیم، اور تنظیم کیسے مستحکم ہوتی ہے؟ جیسے اہم اور ٹھوس موضوعات پر خالص داعیانہ گفتگو۔ کتاب کے مطالعے سے قاری پر دعوت و تبلیغ کا تصور واضح ہوگا اور اسے اپنے اندر کارِ دعوت کے لیے جذبہ و حرارت کا بھی احساس ہوگا۔ فاضل مصنف کی نظر ثانی اور ضروری حذف و اضافہ کے بعد تازہ اور دلکش ایڈیشن۔

صفحات: ۳۴۴ قیمت: ۲۲۵ روپے

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر — ۹۳، علی گڑھ — ۲
مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی — ۲۵

تحریکات اسلامی کی علمی وفکری ترجیحات

——— ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی

دنیا بھر کی اسلامی تحریکات نے مسلمانوں کو عقائد وعبادات سے آگے بڑھ کر سیاست، تہذیب، خاندان و معاشرہ، غیر مسلموں سے تعامل اور زندگی کے تمام میدانوں میں متحرک کرنے کی کوشش کی ہے اور خود کو بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ کرنے کی پالیسی اور پروگرام ترتیب دیے ہیں۔ اس مقالے میں ان موضوعات پر مصر، تیونس اور ہندو پاک کی اسلامی تحریکات کی چند نمائندہ شخصیات کے افکار وآراء سے بحث کی گئی ہے۔

مولانا سید جلال الدین عمری، برصغیر کی تحریک اسلامی کی ایک نمایاں شخصیت ہیں۔ ان موضوعات پر انھوں نے بھی اپنی تصانیف میں اظہار خیال کیا ہے۔ موجودہ دور میں مختلف ممالک سیاسی، نظام میں مسلمانوں کی مشارکت، اصول حکم رانی اور تہذیب و سیاست سے متعلق دیگر موضوعات پر' تحقیقات اسلامی کے فقہی مباحث' اور 'تہذیب و سیاست کی اسلامی قدریں' میں، مسلمان خواتین کے مطلوبہ کردار پر 'عورت اسلامی معاشرہ میں'، اسلام کا عائلی نظام' اور 'عورت اور اسلام' میں اور غیر مسلموں سے ارتباط وتعامل پر، غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق اور غیر اسلامی ریاست میں مسلمان، میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان کی روشنی میں مولانا کے خیالات کا تفصیلی مطالعہ ہونا چاہیے۔

اس مقالے میں جو آراء پیش کی گئی ہیں، ان پر بحث و مذاکرہ کی گنجائش ہے۔ جو حضرات ان پر اظہار خیال کرنا چاہیں، ان کے لیے تحقیقات اسلامی کے صفحات حاضر ہیں۔ (رضی الاسلام)

تحریکِ اسلامی نام ہے دین کے پورے نظامِ فکر و عمل کی طرف دعوت دینے اور اس کو قائم کرنے کے لیے اجتماعی جدو جہد کرنے کا۔ یہ جزو کی نہیں، کل کی دعوت دیتی ہے۔ کسی مخصوص تعلیم سے نہیں، شریعت کی تمام تعلیمات سے بحث کرتی ہے۔ کتاب الٰہی کی چند آیات کا انتخاب نہیں کرتی، بلکہ پورے قرآن کو مرکزِ فکر و عمل بناتی ہے۔ معاشرہ کی فلاح کے لیے کی جانے والی مختلف اسلامی خدمات، دینی تعلیمی اداروں کا قیام، اسلامی عقائد و عبادات کی تعلیم کے لیے دینی مجلسوں اور اصلاحی جلسوں کا انعقاد، بے جا رسوم و روایات سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے اصلاحِ معاشرہ کے نام سے ہونے والی جدو جہد، مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کی کوششیں، فلاحی و رفاہی انجمنوں کی تشکیل کی وہ حمایت بھی کرتی ہے، اور خود بھی یہ خدمات انجام دیتی ہے۔ لیکن انھیں اپنی توانائیوں اور پروگراموں کا مقصود اصلی نہیں بتاتی۔ بلا شبہ یہ مبارک اور مسعود خدمات بڑی قابل قدر ہیں اور ہر طرح کی تائید و تقویت کی مستحق ہیں، لیکن اقدام کو بقاسے، تحریک کو تحفظ سے اور جدید کو قدیم سے ممتاز کیے بغیر ہم تحریک اسلامی کی صحیح تعریف نہیں کر سکتے اور نہ اس کی کما حقہ شناخت ہو سکتی ہے۔ اے دنیا کی تمام اسلامی تحریکوں نے مروجہ دین داری کو احیائے دین کے لیے ناکافی قرار دیا ہے۔ انھوں نے اسلام کو عقائد و عبادات سے آگے بڑھ کر خاندان و معاشرت، سیاست و تہذیب اور معاشرہ و ریاست کے تمام میدانوں میں متحرک اور جاوداں دیکھنے کی آرزو ظاہر کی ہے اور اس کے مطابق نقشۂ کار، حکمت عملی اور منصوبہ سازی کو اپنی پالیسی و پروگرام میں جگہ دی ہے۔

تحریک اسلامی کے ایک کارکن کو دعوت اور اقامت دین کے فریضے کی ادائی میں ایک داعی کا مزاج تشکیل دینا پڑتا ہے۔ داعی کے مزاج سے مراد، اخوان

المسلمون مصر کے رہ نما بہی الخولی کے الفاظ میں یہ ہے کہ وہ درج ذیل ہتھیاروں سے مسلح ہو:

(الف) حقیقت پسندانہ عقلیت، جو محض نظریاتی نہ ہو، بلکہ محسوس ومشاہد ہو اور عمل سے ہم آہنگ ہو۔

(ب) روحانیت، جو مادیت سے کارکن کو بلند کر دے۔ یہ روحانیت معاشرتی ہو، رہبانیت کی طرف مائل نہ کرتی ہو، نہ اسباب و وسائل کو چھوڑنے کی دعوت دیتی ہو۔

(ج) ایجابی فطرت، جو اقدام وعمل پر داعی کو آمادہ کرے اور منفی ذہنیت سے محفوظ رکھے۔ ۲؎

'حقیقت پسندی' کی تشریح کرتے ہوئے فاضل مصنف کہتے ہیں کہ قرآن نے جو اسلوب اختیار کیا ہے اس میں فکر و فلسفہ بھی ہے اور محسوس ومشاہد حقائق کا ادراک بھی۔ کچھ لوگ اپنے افکار ونظریات خالص عقلی وفکری انداز میں پیش کرتے ہیں، علت ومعلول، اسباب ومسببات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں، فکر ونظر کی گہرائیوں میں اتر کر جزئیات وکلیات اور مختلف مفروضات وحقائق کی چھان بین کر کے انھیں عوام کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور بس۔ اس طریقۂ کار سے دل کے تار چھیڑے جا سکتے ہیں نہ دلوں اور دماغوں میں کوئی ہلچل پیدا کی جا سکتی ہے۔ سچا داعی وہ ہے جو عملی زندگی سے بحث کرتا ہے اور واقعات کی دنیا کو موضوع بناتا ہے۔ ۳؎

'معاشرتی روحانیت' سے استاد بہی خولی 'روح اور مادہ کا حسین اور متوازن اجتماع' مراد لیتے ہیں۔ کیوں کہ انسان روح اور مادہ دونوں سے مرکب ہے اور دونوں کا اپنا نظام اور اپنے تقاضے اور مطالبات ہیں۔ اسے روح اور مادہ دونوں کے حقوق حکمت، نظم اور سلیقہ سے ادا کرنا ہے۔ معاشرتی روحانیت سے متصف شخص دونوں زندگیاں جیتا ہے۔ اس کی پرواز دونوں دنیاؤں میں رہتی ہے۔ اس کا جسم زمین پر ہوتا ہے، لیکن حقیقت آسمان پر رہتی ہے۔ اعضاء و جوارح اہل دنیا کی طرح

کام کرتے ہیں، لیکن روحانی صلاحیتیں عارفین حق کی طرح کسی اور ہی مقصد کے لیے وقف ہوتی ہیں۔ وہ رہتا ہے لوگوں کے درمیان، لیکن سیر ملأ اعلیٰ کی کرتا ہے۔ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا سے بے گانہ ہوتا ہے۔ ۴؎

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور
الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذاں اور ہے، مجاہد کی اذاں اور

ایجابی فطرت اور عملی مزاج سے مراد یہ ہے کہ انسان اللہ سے اپنا تعلق جوڑ کر خاموش نہ بیٹھ جائے، ورنہ یہ سلبی روحانیت ہوگی، بلکہ تعلق باللہ اسے اقدام پر، ایجابی منصوبہ بندی پر اور تنقید وعمل پر آمادہ کرے۔ دوسرے لفظوں میں مصنف اسے 'خدائی سیر' کا نام دیتے ہیں، جس کی دو واضح خصوصیات ہیں:

۱۔ ایمان وہ بھڑکتا ہوا انگارہ ہے جس سے داعی قوت عمل اور غیرت حق اکتساب کرتا ہے۔

۲۔ یہ ایک قوت محرکہ ہے جس کی وجہ سے داعی یہ احساس رکھتا ہے کہ تنفیذ اور عمل کی طرف بڑھنا ناگزیر ہے۔

دعوت و اقامت دین کی ان تحریکوں کی جدو جہد علمی وفکری سطح پر بھی ہوتی ہے اور عمل و اقدام کے میدانوں میں بھی۔ ان دونوں کے درمیان توازن قائم رکھنا ایک نازک کام ہے۔ بسا اوقات ملک وملت کے مسائل اور فوری بحرانوں کو حل کرنے میں تحریک اس قدر الجھ جاتی ہے کہ علمی وفکری اہداف نظروں سے اوجھل ہونے لگتے ہیں اور کبھی اس کے علی الرغم پوری تحریک علمی منصوبہ بندی میں اس طرح جت جاتی ہے کہ عملی حقائق اور زمینی واقعات بھی صرف نظر ہو جاتے ہیں۔ توازن اور اعتدال کو قائم رکھتے ہوئے علمی وفکری منصوبہ بندی کا تقاضا ہے کہ:

(الف) تحریک کے کارکن مطالعہ کو اپنی روزمرہ کی عادت بنائیں۔ مولانا

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ (۱۹۲۳ئ۔ ۱۹۷۹ئ) انجینئر مالک بن نبی (۱۹۰۳ئ۔ ۱۹۷۳ئ) شہید مرتضیٰ مطہری (۱۹۱۹ئ۔ ۱۹۷۹ئ) کے علاوہ تحریک سے باہر کے علماء وفضلاء کی تحریروں کا مطالعہ قلب و ذہن کو وسعت بھی بخشے گا اور امت مسلمہ سے قریب بھی کرے گا۔

(ب) تحریک اسلامی کے سنجیدہ اہل قلم اور ارباب تحقیق تحریک سے باہر کے علماء وفضلائ، اربابِ علم وتحقیق سے رابطہ بنائیں۔ انھیں تحریک کی علمی وفکری منصوبہ بندی میں شامل کریں۔ ان کے تعاون و تعامل سے ایسا صالح لٹریچر تیار کریں جو مسلمانوں کی نسأۃ ثانیہ کے لیے ضروری ہے۔ ایک زمانے میں سہ ماہی مجلہ 'تحقیقات اسلامی' علی گڑھ نے اربابِ قلم کی ایک کہکشاں تیار کرنے پر توجہ دی تھی۔ یہ کام مستقل منصوبہ بندی کا متقاضی ہے۔

(ج) دینی مدارس کے علماء اور عصری جامعات کے فضلاء کو ایک ساتھ دعوت دین کے کاز سے جوڑنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ دونوں گروہوں کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج نے امت کو دو متوازی دھاروں میں تقسیم کر دیا ہے اور اس کے نقصانات فکری انتہا پسندی کی شکل میں ظاہر ہو رہے ہیں۔٦ تحریک اسلامی ان دو متوازی دھاروں کو خدمت دین کے مقصد سے قریب کر دے تو امت کے بہت سے فکری بحرانوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

معاصر تعبیر وتشریح کی ضرورت

'مابعد مودودیت' کی اصلاح بعض دانش وروں نے یہ ثابت کرنے کے لیے استعمال کی کہ مولانا مودودیؒ کے افکار اب بدلتے حالات کا ساتھ نہیں دیتے۔ یہ سید مودودیؒ کی تحریروں کے ناقص فہم کا ثمرہ ہے، یا ان کے مقام ومرتبے کے ساتھ ناانصافی کرنے کی جارحانہ ذہنیت کی عکاسی ہے۔ ۱۵-۱۴/ جولائی ۲۰۱۲ء کو الجامعہ الاسلامیہ شانتا پورم کیرالہ میں اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا کی اسلامک

اکیڈمک کانفرنس میں خاک سار نے 'مودودیؒ کا مطالعہ - معاصر دور میں' کے موضوع پر ایک بحث پیش کی۔ سید مودودیؒ نے احیائے اسلام کے لیے دستوری اور جمہوری جدو جہد کی جو اسکیم تیار کی تھی، وہ گفتگو کا خاص نکتہ تھی۔ اس کی افادیت آج پہلی سے زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ ۷؎

بلا شبہ سید مودودیؒ نے جن حالات میں تحریک اسلامی کا نظریہ پیش کیا تھا، وہ اب کافی بدل چکے ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات میں دین کی نئی تعبیر و تشریح کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ یہ نئی تعبیر سید مودودیؒ کے فکر کی توسیع ہوگی، تغلیط نہیں۔ سید سعادت اللہ حسینی نے تحریک اسلامی ہند کے سیاق و سباق میں دعوت فکر دی ہے کہ جماعت اسلامی کے مصنفین 'مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش' کی سیاسی بحث کو کیوں آگے نہ بڑھا سکے؟ کیوں استعمار سے آزاد ملک کے احوال میں کوئی ایسا سیاسی فلسفہ تشکیل نہیں دیا جا سکا جو 'مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش' کی بحث کا فطری ارتقاء بھی ہوتا اور نئے احوال میں رہ نمائی کا ذریعہ بھی بنتا۔ ۸؎

سید مودودیؒ نے مغربی جمہوریت کو اسلام کے نظام شورائیت سے متصادم قرار دیا تھا۔ اسلامی ریاست ''نہ تو مغربی اصطلاح کے مطابق مذہبی حکومت ہے اور نہ جمہوری حکومت، بلکہ وہ ان دونوں کے درمیان ایک الگ نوعیت کا نظام سیاست و تمدن ہے''۔ ۹؎ مغربی اصطلاح میں مذہبی حکومت دو بنیادی تصورات کا مجموعہ ہے: ایک خدا کی بادشاہی، قانونی حاکمیت کے معنیٰ میں۔ دوسرے پادریوں اور مذہبی پیشواؤں کا ایک طبقہ، جو خدا کا نمائندہ اور ترجمان بن کر خدا کی اس بادشاہی کو قانونی اور سیاسی حیثیت سے عملاً نافذ کرے۔ مولانا مودودیؒ نے مغربی جمہوریت کو بھی دو تصورات کا مجموعہ قرار دیا تھا:

۱۔ عوام کی قانونی اور سیاسی حاکمیت، جو عوام کی اکثریت، یا ان کے منتخب کیے ہوئے نمائندوں کی اکثریت کے ذریعہ عملاً ظہور میں آئے۔

۲۔ ریاست کا انتظام کرنے والی حکومت کا عوام کی آزادانہ خواہش سے بننا

اور بدل سکنا۔

مغرب کے تصور مذہبی حکومت کے صرف ایک جزو کو سید مودودیؒ نے اسلام سے ہم آہنگ بتایا اور وہ ہے 'خدا کی حاکمیت کا عقیدہ'۔ انھوں نے جمہوریت کے قانونی حاکمیت کے تصور کو اللہ کے لیے خاص کیا اور سیاسی حاکمیت کو خلافت قرار دے کر اسے ریاست کے عام مسلمان باشندوں کے حوالے کر دیا۔ اس طرح اسلامی ریاست کو مغربی اصطلاح کے مطابق جمہوریت قرار دینے کو سید مودودیؒ نے غلط قرار دیا۔ ۱۰

جماعت اسلامی ہند نے بدلتے ہوئے حالات کا ادراک کیا۔ ہندوستان میں رائج جمہوریت کی حمایت وتقویت، ملکی انتخابات میں شرکت کا جواز، انتظامی اداروں میں ملازمت کا حصول، سیکولر سیاسی افراد اور جماعتوں سے ارتباط و تعاون اور سیاسی نظام میں مسلمانوں کی حصہ داری کے لیے اس کے فیصلے اور کل ہند ویلفیر پارٹی کی تشکیل وغیرہ ایسے اقدامات ہیں، جن کا فیصلہ جماعت اسلامی ہند نے طویل مشاورت اور اجتماعی اجتہاد کے بعد کیا، مگر اس کی تائید میں اسلامی لٹریچر کی تیاری کا کام ابھی باقی ہے۔ مولانا مودودیؒ کی تحریں ان فیصلوں کی تائید کرتی نظر نہیں آتیں۔ بدلتے ہوئے حالات میں نئی تعبیر وتشریح کی فوری ضرورت کا احساس جماعت اسلامی ہند کے اکابر کو بھی ہے۔

عالم عرب کی طاقت ور اسلامی تحریک اخوان المسلمون ۱۹۲۸ء میں قائم ہوئی۔ سید قطب شہیدؒ اس کے نظریہ ساز قرار پائے۔ ۱۹۵۳ء میں وہ اخوان میں شامل ہوئے اور اس کے ترجمان 'الاخوان المسلمون' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ آگے چل کر وہ مکتب الارشاد (مجلس عاملہ) کے رکن بنے۔ انھوں نے اپنے طاقت ور اور موثر اسلوب میں عالم عرب کے حالات پر اسلامی رہ نمائی کا فریضہ ادا کرنا شروع کیا۔ جنوری ۱۹۶۴ء میں ان کی معرکہ آراء تصنیف 'معالم فی الطریق' منظر عام پر آئی۔ اس کتاب نے یہ بحث زور شور سے اٹھائی کہ آج پوری دنیا جہالت و جاہلیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس جاہلیت کی بنیاد ہے اللہ کے اقتدار اعلیٰ پر دست درازی اور

حاکمیت الٰہ سے بغاوت۔ ۱۱؎ تمام عرب اور مسلم حکومتیں اس جہالت و جاہلیت کو فروغ دے رہی ہیں۔ اس لیے سید قطب شہیدؒ نے کہا کہ ’’آج احیاء اسلام کا آغاز اس ہراول دستے سے ہوگا جو اس کارِعظیم کا عزم مصمم لے کر اٹھے اور پھر مسلسل منزل کی طرف پیش قدمی کرتا چلا جائے اور جاہلیت کے اس بے کراں سمندر کو چیرتا ہوا آگے کی جانب رواں دواں رہے‘‘۔ ۱۳؎ یہی کتاب ۱۹۶۶ء میں فاضل مصنف کی شہادت کا سبب قرار دی گئی۔ ۱۴؎

مصر اور پورے عالم عرب میں جبر وظلم کی ایک طویل تاریخ سے گزر کر اخوان مجاہدین نے دعوت واقامت دین کا فریضہ انجام دیا۔ ان کے متعدد رہ نماؤں کو تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا۔ تزکیہ وشہادت کے اس پورے سفر میں سید قطب شہیدؒ کی تحریریں ہی مرکز توجہ رہی ہیں۔ دوسرے اخوان مصنفین نے بلا شبہ دعوت وتربیت کے لیے بے شمار موضوعات پر اپنی یادگار تخلیقات پیش کیں، لیکن ان کی حیثیت تفہیم و تشریح سے زیادہ نہ تھی۔ البتہ دوسرے مرشد عام جناب حسن بن اسماعیل الہضیبیؒ (۱۸۹۱ئ۔ ۱۹۷۳ئ) کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ۱۷/اکتوبر ۱۹۵۱ء کو وہ مرشد عام منتخب ہوئے۔ انھوں نے مارچ ۱۹۲۴ء تک مصری عدالتوں میں وکالت کرنے کے بعد ستائیس (۲۷) برس جج کے فرائض بھی انجام دیے تھے۔ قانونی وفقہی امور میں مہارت رکھنے کے علاوہ اخوان کے اندر ایک گروہ کی فکر میں پرورش پانے والی انتہا پسندی پر وہ سخت مضطرب تھے۔ انھوں نے پوری کوشش کی کہ اخوان ملکی قوانین کی پابندی کریں اور حکومت سے کوئی تصادم مول نہ لیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنی معروف زمانہ تصنیف ’دعاۃ لا قضاۃ‘ تصنیف کی۔ ۱۵؎ جس میں یہ نقطۂ نظر پیش کیا کہ قرآن وسنت کی روشنی میں داعیان دین کی یہ ذمہ داری تو ہے کہ وہ اصلاح واحیاء کے لیے کما حقہ جدو جہد کریں، افراد واقوام کو زبردستی اور قوت کے استعمال سے راہِ ہدایت پر لانا ان کی ذمہ داری نہیں ہے اور غیر مسلم معاشرہ میں رہنے والے مسلمان اپنی نیت اور عمل کے مطابق اللہ کے سامنے جواب دہ ہیں۔

ان کے خلاف تکفیر وتفسیق کی مہم چلانا، دعوت دین کے دائرہ سے باہر ہے۔ شیخ الہضیبیؒ کی اس صراحت و وضاحت کے باوجود انتہا پسند نوجوانوں نے 'جماعة التکفیر و الهجرة' کے نام سے ایک الگ گروپ تشکیل دے دیا۔ ۱۹۶۱ء اور مصر میں فکری انتہا پسندی کی ایک نئی لہر آ گئی۔ اس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ آج بھی سید قطب شہیدؒ کی تحریریں عالم عرب میں سب سے زیادہ مقبول ہیں۔ اخوان مفکرین بدلے ہوئے حالات میں نئی تعبیر وتشریح کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

تکثیری معاشرہ اور اس کے تقاضے

تکثیریت کی ایک تفہیم، جو موجودہ دور میں رائج ہے، اس بات کی متقاضی ہے کہ سارے مذاہب اور متنوع افکار کو بیک وقت درست مانا جائے اور کسی عقیدہ، فلسفہ یا فکر پر تنقید نہ کی جائے۔ گویا معاشرے میں موجود سارے افکار اور فلسفے اپنی انفرادیت کھو کر ایک نئی فکر اور فلسفہ تشکیل دیں، جس میں سب کی سوچ، ذہنیت اور رنگ و آہنگ شامل ہو۔ اس فکر کے مطابق کسی ایک فکر یا عقیدے کی صداقت پر اصرار باقی نہیں رہتا۔ تکثیری معاشرہ کا ایک دوسرا فہم یہ ہے کہ مختلف ومتصادم افکار و نظریات اور عقائد کو یکساں آزادی حاصل ہو۔ کسی فکر کو صحیح سمجھنے والا آزاد ہو کہ اس فکر کی معقولیت اور نافعیت کے اثبات کر سکے اور علمی انداز اور شائستہ اسلوب میں دوسرے نظریہ پر تنقید و جرح کر سکے۔ گویا اپنے نظریے پر قائم رہتے ہوئے، دوسرے نظریات سے مباحثہ و مجادلہ کی راہ اختیار کرے۔ اس طرح تمام افکار و مذاہب کے لیے مکالمہ کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

موجودہ دور کے مسلم مفکرین نے تکثیریت کے آخر الذکر فہم کو تسلیم کیا ہے۔ انھوں نے اسلام کی حقانیت پر ایمان رکھنے کے ساتھ دوسرے مذاہب ونظریات کی آزادی وحقوق کو خوش دلی سے برحق مانا ہے اور مکالمہ اور اشتراک وتعاون کے لیے راہیں استوار کیں ہیں۔

ڈاکٹر فضل الرحمن فریدی (۱۹۳۲ئ ۔۲۰۱۱ئ) نے غیر اسلامی قوتوں سے اشتراک کی حدود دکار پر مفصل گفتگو کی ہے۔ ان کے خیال میں مکہ میں حلف الفضول کا تاریخی معاہدہ، جس میں اللہ کے رسول ﷺ نے نبوت سے قبل ایک تکثیری معاشرہ کے اندر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، مسلمانوں کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ یہ ایک معاہدہ تھا، جس میں مشرکین، ملحدین اور مؤحدین سب نے متحد ہو کر برائی اور ناانصافی کے خلاف مشترکہ جدوجہد کرنے کا عہد باندھا تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ عہد رسالت میں بھی اس معاہدہ کی بڑی قدر کرتے تھے اور ایک روایت کے مطابق آپؐ نے فرمایا تھا کہ اگر اس طرح کا کوئی معاہدہ دوبارہ ہو تو آپؐ اس میں شریک ہونا پسند کریں گے۔ ڈاکٹر فریدی کہتے ہیں: ''اس قسم کی کاوشوں میں تعاون مسلمانوں کا اخلاقی فریضہ ہے۔ اپنے تعاون کو اس شرط پر مشروط کرنا کہ اس طرح کی کوشش جامع اور ہمہ جہت ہو اور معاشرے کی بنیادی برائیوں کا انسداد اس میں شامل ہو، صحیح نہیں ہے'' ۔۱۷؎

حزب النہضۃ تیونس کے رہ نما راشد الغنوشی (پ ۱۹۴۱ئ) اسلام کے نظام عدلِ اجتماعی کے قیام کے لیے شراکتِ اقتدار کو ناگزیر تصور کرتے ہیں، خواہ وہ معاشرہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ اس شراکت کے لیے ضروری نہیں ہے کہ شریعت اسلامیہ کی تنفیذ اس کا مطمح نظر ہو۔ ملک میں آمریت اور ڈکٹیٹر شپ کو روکنے کے لیے بھی یہ شراکت کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح آزادی، ترقی، سماجی استحکام، شہری آزادیوں کے حصول، حقوق انسانی کے احترام، سیاسی تکثیریت کی پاس داری، عدلیہ کی آزادی کی بحالی، آزادی اظہارِ رائے، اسلامی اوقاف، مساجد و مدارس کے تحفظ وغیرہ، وسیع تر مقاصد میں غیر مسلموں کی شراکت کے ساتھ بے دین اور ملحد قوتوں کے ساتھ حصہ داری نبھائی جاسکتی ہے۔ ۱۸؎

غیر اسلامی حکومتوں میں شراکت کا ثبوت راشد الغنوشی نے قرآن کریم سے فراہم کیا ہے۔ وہ سورۂ یوسف کی آیت ۵۵ سے استدلال کرتے ہیں، جس میں ہے کہ حضرت یوسفؑ نے شاہِ مصر سے درخواست کی تھی کہ ملک کے خزانے میرے سپرد کر

دیجیے، کیوں کہ میں ان کی حفاظت کرسکتا ہوں: (قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْم) ۔اس کے بعد قرآن حضرت یوسفؑ کے کامل تسلط اور ہمہ گیر اقتدار کو اس طرح بیان کرتا ہے:

وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَاءُ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ

(یوسف ۵۶)

''اس طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسفؑ کے لیے اقتدار کی راہ ہموار کی۔ وہ مختار تھا کہ جہاں چاہے اپنی جگہ بنائے۔ ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں۔ نیک لوگوں کا اجر ہمارے یہاں مارا نہیں جاتا''۔

حضرت یوسفؑ کا حوالہ دے کر شیخ الغنوشی نے لکھا کہ پیغمبر وقت کو جیل کی سزا کھانی پڑی، سوتیلے بھائیوں کے ناروا سلوک کو برداشت کرنا پڑا، مگر جب صحیح وقت آیا تو شاہ مصر کے دربار میں سب سے اہم ذمہ داری بڑھ کر قبول کی، تاکہ قحط اور خشک سالی میں مبتلا عوام کو راحت پہنچا سکیں۔ انھوں نے یہ انتظار نہ کیا کہ مصری عوام دعوت توحید کو قبول کرلیں اور شرک وکفر کو چھوڑ کر مؤحد بن جائیں، تاکہ ایک اسلامی ریاست کی تشکیل ہو سکے۔ ۱۹؎

شیخ راشد الغنوشی نے سیرت طیبہ سے ہجرت حبشہ کی مثال بھی پیش کی ہے، جو بڑی دل چسپ ہے۔ حبشہ کا بادشاہ عیسائی تھا، مگر انصاف پسند تھا۔ مکہ میں جب حالات ناقابل برداشت حد تک پہنچ گئے تو رجب ۴۵ عام الفیل/ ۵ بنوی میں اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

لو خرجتم الى أرض الحبشة، فان بها ملكاً لا يظلم عنده أحد، وهي أرض صدق حتى يجعل الله لكم فيكم خرجاً مما أنتم۔ ۲۰؎

''اچھا ہو کہ تم لوگ نکل کر حبشہ چلے جاؤ۔ وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور وہ بھلائی کی سرزمین ہے۔ جب تک اللہ

تمہاری اس مصیبت کو رفع کرنے کی کوئی صورت پیدا کرے، تم لوگ وہاں ٹھہرے رہو''۔

اس ارشاد کی بنا پر گیارہ مرد اور چار خواتین نے حبشہ کی راہ لی۔ پھر چند مہینوں کے اندر مزید لوگوں نے ہجرت کی، یہاں تک کہ ۸۳/مرد، گیارہ عورتیں اور ۷/غیر قریشی مسلمان حبشہ میں جمع ہو گئے اور مکہ میں نبی ﷺ کے ساتھ صرف چالیس آدمی رہ گئے تھے۔ ۲۱؎ صحابہ وصحابیات کی حبشہ آمد کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ مسلمان ہو گیا، اگرچہ اس نے اسلامی شریعت ملک میں نافذ نہ کی۔ اسے خدشہ ہوا کہ اسلام قبول کرنے کا اعلان ہوتے ہی اس کی سلطنت خطرہ میں پڑ جائے گی اور مہاجرین کا تحفظ مشکل ہو جائے گا۔ جب شاہِ حبشہ کا انتقال ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی۔ ۲۲؎

ہندوستان کے ممتاز عالم دین مولانا سلطان احمد اصلاحیؒ (۱۹۵۲ئ۔ ۲۰۱۶ئ) نے اس موضوع کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنی کتاب 'مسلمان اقلیتوں کا مطلوبہ کردار' میں ہندوستانی مسلمانوں کے شرعی اور اسلامی کردار پر کھل کر گفتگو کی ہے۔ انھوں نے ملک وملت کی تعمیر اور بھلائی کے کاموں میں شرکت کو 'ہر مسلمان کی دینی زندگی کا لازمی ایجنڈا' قرار دیا ہے۔ ۲۳؎ انھوں نے مسلمانوں کو تاکید کی کہ ان کی اجتماعیت 'غیر متحارب اور غیر نزاعی' ہو، اس پر سخت نگاہ رکھی جائے کہ سیاسی غیر سیاسی، کسی دائرے میں اس کا رنگ و آہنگ معاندانہ نہ ہونے پائے اور ان کی تمام تر دینی اور مذہبی جماعتوں کا کردار اصلاً دعوتی، رفاہی اور اصلاحی رہے۔ ۲۴؎ انھوں نے بھی حضرت یوسفؑ اور شاہِ حبشہ کے دونوں نمونوں سے استدلال کیا کہ غیر مسلم اکثریت کے درمیان کسی منصب کو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور ضرورت کے تقاضے سے غیر دینی نظام حکومت کے ساتھ اشتراک وتعاون کی راہ عام مسلمان کے لیے درست اور صائب ہے۔ ۲۵؎ اس معاملے میں کلیدی مناسب ہوں یا غیر کلیدی مناصب، سب یکساں ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ''عدلیہ انتظامیہ اور مقننہ کی چھوٹی بڑی ہر طرح کی ملازمت اور

چھوٹا بڑا ہر طرح کا عہدہ ومنصب مسلمان اقلیت کی یکساں ضرورت ہے۔۲۶؎

مولانا اصلاحیؒ ملک کی مقننہ یعنی اس کی اسمبلی اور پارلیمنٹ اور اس کے واسطے سے حکومت اور وزارت میں مسلمان اقلیت کی مؤثر حصہ داری کے لیے انتخابات میں شرکت کو ضروری قرار دیتے ہیں اور قوم اور اجتماعیت کی حیثیت سے مسلمان امت کو ہوم ورک اور منصوبہ بندی کی تلقین کرتے ہیں۔ اسی طرح انتظامیہ و عدلیہ میں جگہ پانے کے لیے مقابلہ جاتی امتحانات میں شرکت کو ضروری تصور کرتے ہیں۔ ۲۷؎

تکثیری معاشرے میں اسلام کی رہ نمائی سے متعلق یہ تخلیقات بہت اہم ہیں مگر بہت سے سوالات ہنوز حل طلب ہیں۔ اس نئے فلسفے کی مکمل اسلامی تفہیم ابھی باقی ہے اور اس کے بطن سے جنم لینے والے اشکالات کا شافی جواب دینا اسلامی تحریکوں کا فوری مسئلہ ہے۔

خواتین کے اسلامی کردار کی بحالی

'خواتین کی آزادی عہد رسالت میں' شیخ عبد الحلیم ابو شقہ کی ایک مشہور کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ آج کی مسلمان عورت دو جاہلیتوں میں سے کسی ایک کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔ ایک طرف ''چودھویں صدی ہجری میں پائے جانے والے غلو، تشدد اور آباء و اجداد کی اندھی تقلید کی جاہلیت'' ہے اور دوسری طرف ''بیسویں صدی عیسوی میں پائی جانے والی برہنگی، اباحیت اور مغرب کی اندھی تقلید کی جاہلیت'' ہے۔ اور یہ دونوں جاہلیتیں اللہ کی شریعت سے بغاوت کے مترادف ہیں۔ ۲۸؎ مسلم عورت روایت اور تجدد کی ان دونوں جاہلیتوں کے درمیان پس کر رہ گئی ہے۔

فاضل مصنف کا خیال ہے کہ عورت سماج کا نصف حصہ ہے، لیکن وہ عضو معطل کی مانند ہے، کیوں کہ وہ ایک مجاہد نسل پیدا نہیں کر رہی ہے، نہ امت مسلمہ کی سیاسی و معاشرتی بیداری میں حصہ لے رہی ہے۔ لہٰذا مسلم عورت کی آزادی مسلمان

معاشرے کے نصف حصہ کی آزادی ہے اور عورت اس وقت تک آزاد نہیں ہوسکتی جب تک مرد نہ آزاد ہو اور دونوں اسی صورت میں آزاد ہو سکتے ہیں جب اللہ کی شریعت وہدایت کا اتباع کیا جائے۔۲۹؎

سماجی زندگی میں خواتین کا اسلامی کردار کیوں گم ہوگیا ہے؟ فاضل مصنف نے اس کے درج ذیل اسباب بیان کیے ہیں:

۱۔ باقی ماندہ جاہلی عادات ورسوم کے اثرات، خواہ عرب جاہلیت کے رسوم ہوں یا اسلام میں داخل ہونے والی دوسری اقوام کی رسوم وروایات۔

۲۔ مسلم معاشرے میں موجود تشدد اور غلو کے رجحانات۔

۳۔ بعض علماء سلف کے غلط یا مرجوح اجتہادات، جن کے سنگین نتائج کا اثر جمود اور تقلید کی وجہ سے صدیوں رہا۔

۴۔ احادیث کی سندوں کی تحقیق ائمہ اربعہ کے دور کے بہت بعد میں ہوئی اور خود ائمہ کے بعض اقوال احادیث کی میزان پر تولے نہیں جاسکتے۔ اس طرح سند کی مخالفت بعض امور میں ہوئی۔ ۳۰؎

دورِ نبویؐ میں خواتین کو جو مقام و مرتبہ حاصل تھا اور وہ جن حقوق اور آزادیوں سے بہرہ ور تھیں، انھیں بحال کرنا اسلامی تحریکوں کی ترجیحات میں داخل ہے۔ دعوت و اصلاح اور تجدید واحیاء کا کام تشفی بخش طریقے سے اسی وقت انجام پا سکتا ہے جب کہ معاشرہ کے اس نصف حصہ کی سماجی زندگی اسلام کی روشنی میں بحال ہو۔

مصری مصنف شیخ محمد الغزالیؒ (۱۹۱۷ئ۔۱۹۹۶ئ) چودھویں صدی ہجری میں مسلم امت کے زوال کے اسباب پر گفتگو کرتے ہیں تو درج ذیل امور کی نشان دہی کرتے ہیں:

۱۔ دین کا ناقص فہم

۲۔ نااہل اور بددیانت افراد کا قیادت کے منصب پر فائز ہونا

۳۔ دین سے خواتین کے تعلق کی کمزوری۔

۴۔ اساطیری تصور مذہب پر بڑھتا ہوا یقین۔ ۳۱؎

انھوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ کی ایک بیوی مسجد نبوی میں فجر اور عشاء کی نمازیں جماعت سے ادا کرتی تھیں۔ ان سے پوچھا گیا: آپ گھر سے باہر کیوں نکلتی ہیں؟ جب کہ آپ کو معلوم ہے کہ عمرؓ اسے سخت ناپسند کرتے ہیں اور خلافِ غیرت تصور کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا: پھر وہ مجھے حکماً کیوں نہیں روک دیتے؟ لوگوں نے کہا: انھیں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد روک رہا ہے کہ ''اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں جانے سے مت روکو''۔ ۳۲؎ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے یہ حدیث روایت کی تو ان کے بیٹے نے کہا: بخدا ہم انھیں مسجدوں میں نہیں جانے دیں گے۔ باپ بیٹے پر سخت ناراض ہوئے اور ان کی یہ ناراضگی آخر تک برقرار رہی۔ اس تاریخی واقعہ کو نقل کر کے شیخ الغزالی تأسف کا اظہار کرتے ہیں:

> ''یہ عجیب معاملہ ہے کہ ملت اسلامیہ اپنے آخری ادوار میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے صاحب زادے کے مسلک کی تو قائل ہوگئی، لیکن باپ کی روایت کردہ حدیث سے اس نے نظریں پھیر لیں۔ چنانچہ پنج وقتہ نمازوں کی مسجدوں میں ادائیگی اور خطبات و دروس کی سماعت و استفادہ سے عورتیں آج تک محروم چلی آرہی ہیں۔ مسجدوں سے عورتوں کو محروم کرنے کی یہ روش پوری تاریخ میں برقرار رہی، جس کی وجہ سے مسلم خاندان کا زبردست نقصان ہوا اور فرض عبادات سے بھی ان کا رشتہ ٹوٹ گیا''۔ ۳۳؎

ڈاکٹر فضل الرحمن فریدیؒ خواتین کے حقوق سے غفلت اور غیر دانش مندانہ حکمت عملی اختیار کرنے کو تحریک اسلامی کے لیے مضر خیال کرتے ہیں۔ ان کا درمندانہ تجزیہ یہ ہے کہ علماء دین اور اسلامی تحریکوں کو خواتین کے معاملے میں 'دفاع اور تحفظ' کی جگہ اسلامی نقطۂ نظر کا پوری قوت سے اثبات کرنا چاہیے اور اقدامی انداز اختیار کرنا چاہیے۔ ایسا اثبات جس سے ایک طرف اسلامی نظام فکر کی خیر و برکات اور

اس کے توازن اور عدل واضح ہوتے جائیں اور دوسری طرف عصری نقطۂ نظر کی بنیادیں منہدم ہوتی چلی جائیں اور اس کی اساس پر تشکیل پانے والے سماج کی خیرہ کن تاب ناکی کے پس پردہ تاریکیوں کی جھلک بھی دکھائی جاتی رہے۔

اس اثبات کا محور، ڈاکٹر فریدی کے الفاظ میں 'اسلامی نظام فکر وعمل اور اس کے اصول و اقدار ہوں گے۔ ان کی واضح اور جرأت مندانہ تفسیر اور تعبیر کی ضرورت ہے۔ خواتین کے کردار کے اس اثبات کا مطلب اس تاریخی ثقافت اور ان تمام اداروں کا اثبات ہرگز نہیں ہے جسے ملت اسلامیہ نے اپنے طویل سفر میں اپنی اجتماعی زندگی کا لازمی جزو بنا لیا ہے۔ ہمارے رجحانات اور ہماری مرضیات، ہمارے رسم و رواج اور ہماری کلچرل اقدار، ان سب سے نکھار کر اس کا اثبات اور توضیح وقت کا بھی تقاضا ہیں اور ہماری دینی ذمہ داری بھی۔ ۳۴؎

ڈاکٹر فریدی کو اس بات کا ادراک ہے کہ علماء امت نے ہر دور میں خواتین کے حقوق اور ازدواجی تعلقات کے متعلق اسلامی بنیادوں کی تعلیم اور تشریح کے ذریعہ اصلاح کی جدو جہد جاری رکھی، مگر ان پر بھی تحفظ کا داعیہ غالب ہو گیا۔ خطرے کے مبالغہ آمیز احساسات کی وجہ سے اس امر کا اہتمام نہ کیا جا سکا کہ حقیقی اسلامی اقدار اور کلچر کے حشو وزوائد کو ممیز کیا جاتا رہے، بلکہ دین دار حلقوں کی ہمت افزائی کی گئی کہ جو کچھ بھی سرمایہ موجود ہے اس کو برقرار رکھا جائے اور انحطاط سے بچایا جائے۔ تحفظ کی اس جدو جہد میں اسلامی تعلیمات اور مسلم کلچر کی تفریق کا لحاظ نہ کیا جا سکا۔ ۳۵؎

ڈاکٹر فریدی بعض دین دار حلقوں کا یہ اعتراض نقل کرتے ہیں کہ مدینہ کی سوسائٹی عفیف اور پاکیزہ سوسائٹی تھی، لیکن ہم ایسے دور میں سانس لے رہے ہیں جہاں اباحیت کا غلبہ ہے، اس لیے ہمیں مزید پابندیاں لگانی پڑیں گی، بعض مباحات کو ممنوع قرار دینا ہوگا اور اجتماعی تعامل کی بعض راہوں کو بند کرنا پڑے گا، جو اس پاکیزہ سماج میں موجود تھیں۔ ڈاکٹر فریدی اس اعتراض کو دو وجوہ سے رد کرتے ہیں:

۱۔ مدینہ کے معاشرے میں بھی غلط عناصر موجود تھے، اگرچہ ان کی تعداد

حد درجہ قلیل تھی۔ منافقین ومتربصین ہر وقت گھات لگائے رہتے تھے۔

۲۔ قرآن کریم کے احکام ہر معاشرہ کے لیے ہیں، خواہ وہ مدینہ منورہ کا پاکیزہ سماج ہو، یا آج کا اباحیت زدہ ماحول۔۳۶

ڈاکٹر فریدی دور حاضر کے بعض رجحانات کو صحت مند قرار دیتے ہیں، کیوں کہ یہ اپنی اصل کے اعتبار سے اسلامی نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہیں، حالاں کہ خدائی ہدایات کی بے نیازی نے ان کی تعبیر میں افراط اور تفریط کی راہ پیدا کر دی ہے۔ وہ رجحانات یہ ہیں:

۱۔ خواتین کی عمومی مظلومیت اور ضعف کو دور کرنے اور ان کو انسانی حقوق دلانے کی عام جدو جہد۔

۲۔ اجتماعی امور میں ان کے اشتراک میں اضافہ کی جدو جہد۔

۳۔ خواتین کے درمیان جہالت دور کرنے اور تعلیم کے ممکنہ وسائل بہم پہنچانے کی جدو جہد۔

۴۔ عائلی زندگی میں خواتین کو منصفانہ حقوق دلانے کی جدو جہد۔

۵۔ عورت کو مرد سے فروتر سمجھنے کے نقطۂ نظر کی اصلاح۔

۶۔ معاشی زندگی میں عورت کو استقلال عطا کرنے کی جدو جہد۔۳۷

فاضل مصنف ان رجحانات کو بلا سوچے سمجھے تسلیم کرنے کا مشورہ نہیں دیتے، کیوں کہ ان کے علم بردار بالعموم دین و مذہب سے بیگانہ ہیں۔ ان کی فکر میں ژولیدگی اور ابہام ہے، ان کی تعبیریں خواہش نفس اور تجدد کی ترجمان ہیں اور ان میں افراط وتفریط بھی ہے اور ردعمل بھی۔ اگر اسلامی تحریک کوشش کرے تو اسلام کے عادلانہ اور متوازن فکر کے طفیل ان قدروں کا متوازن امتزاج اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے جو عصری اصطلاحات کی زبان میں سمجھ میں آسکے۔۴۰

غیر مسلموں سے تعامل

بیسویں صدی میں مغرب کے لادینی نظام کے خلاف اسلامی تحریکوں نے

بلا شبہ عظیم الشان لٹریچر تیار کیا، جس نے مغرب کے الحاد پر تنقید کرنے کے ساتھ اس کے استعماری عزائم کو بھی بے نقاب کیا۔ مغرب کی فکری و عسکری یلغار نے مسلمان علمائ، مصلحین اور داعیان کو آمادہ کیا کہ وہ ایک نئے علم الکلام کے ذریعہ اسلام کی حقانیت پر مسلمانوں کے ایمان و اعتقاد کو بحال کریں اور عقلی استدلال کے ساتھ جانب دار اسلوب میں نظام زندگی کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کریں۔ علامہ اقبالؒ نے بالکل درست تبصرہ کیا تھا ؎

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

محمد اقبال، سید مودودی، سید ابوالحسن علی ندوی (۱۹۱۴ئ۔۱۹۹۹ئ) مریم جمیلہ (۱۹۳۴ئ۔ ۲۰۱۲ئ) سید قطب، محمد قطب (۱۹۱۹ئ۔ ۲۰۱۴ئ) محمد الغزالی، ڈاکٹر علی شریعتی، شہید مرتضی مطہری، سید حسین نصر، طارق رمضان (پ۱۹۶۲ئ) خورشید احمد (پ ۱۹۳۲ئ) مالک بن نبی، بدیع الزماں سعید نورسی (۱۸۷۳ئ۔۱۹۶۰ئ) رحمہم اللہ جیسے دانش وروں اور علماء کی ایک کہکشاں ہے، جس نے مغربی فکر و فلسفہ کے خلاف اسلام کی صداقت، معقولیت اور نافعیت کو ثابت کرنے کے لیے اپنے اپنے ملکوں میں صالح ادب تیار کیا۔ اس لٹریچر کا بین الاقوامی زبانوں میں ترجمہ ہوا، جس کی وجہ سے اس کے اثرات کسی ایک خطہ تک محدود نہ رہ سکے۔ دھیرے دھیرے فکر کی مرعوبیت، احساس کم تری اور معذرت خواہانہ ذہنیت کا خاتمہ ہوا۔ مسلم نوجوان اسلام و ایقان کی دولت سے مالا مال ہو کر دعوت و احیاء دین کی جدو جہد میں لگ گئے۔

مغرب نے اسلامی تحریکوں کو بدنام کرنے اور احیاء اسلام کے مشن کو ناکام بنانے کے لیے عسکری و علمی تمام حربے اختیار کیے، مگر عالم اسلام میں مغرب کے خلاف نفرت بڑھتی گئی اور اسلامی تحریکوں کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ دھیرے دھیرے بعض عوامل کے تحت پوری غیر مسلم دنیا مسلمانوں کی نفرت میں محارب اور

معاند بن گئی۔ امریکہ اور مغرب کی جارحیت پسند حکومتیں ہی نہیں، وہاں کے عوام بھی دشمنوں کی صف میں کھڑے کر دیے گئے اور ان سے مسلمانوں کا انسانی تعامل تھم گیا، جس کے نتیجے میں دعوت اسلامی کا دائرہ کار عملاً مسلمانوں کے اندر محدود ہو کر رہ گیا۔ اس کا براہ راست نقصان اسلامی تحریکوں کو پہنچا۔ اسلام، مسلمان اور اسلامی تحریک سے مغرب کی دوری بڑھی۔ دونوں کے درمیان غلط فہمیاں تیزی سے پرورش پائیں۔ طرفہ تماشا یہ ہوا کہ مسلمان ممالک کی مغرب نواز قیادت نے اپنے مفاداتِ حاصلہ کے تحفظ کے لیے اسلامی قائدین کو ہر طرح کی بنیادی سہولتوں اور آئینی و دستوری حقوق سے محروم کیا، بلکہ ان پر بے پناہ ظلم وستم روا رکھا۔ قید و بند سے لے کر تختۂ دار تک تمام صعوبتیں ان پر مسلط کر کے ان کی زندگی اجیرن بنا دی۔ ردّعمل میں اسلامی تحریکوں اور مسلم سربراہان مملکت کے درمیان کشاکش بڑھی۔ اوپر سے مغرب نے مسلم ممالک پر مسلط کردہ رہ نماؤں کی حمایت کی اور انہیں اپنے عوام پر بدترین مظالم ڈھانے کی کھلی چھوٹ دے دی۔ جمہوری وانسانی اقدار کی کھلم کھلا خلاف ورزی نے مسلم ملکوں میں بھی اور مغرب میں کام کرنے والے بعض افراد، حلقوں اور اداروں کے اندر بھی انتہاپسندی اور تشدد کو فروغ دیا، جس کا خمیازہ آج پوری امتِ مسلمہ کو بھگتنا پڑا ہے۔ بعض حلقے اور جماعتیں پورے مغرب کو دشمن قرار دے کر اس کے خلاف جنگ لڑنے کی نظریہ کاری کر رہی ہیں۔ مسلمانوں اور مغرب کے درمیان یہ کشاکش دعوت اسلامی کو کام کرنے کا موقع نہیں دے رہی ہے۔ مغرب کو حالت جنگ میں کھڑا کر کے انھوں نے وہاں کے انسانوں سے سماجی ومعاشرتی تعامل کی راہ بند کر دی۔ اس پر وقفہ وقفہ سے انجام پانے والی پرتشدد کارروائیاں حالات کو اور سنگین بنا دیتی ہیں۔ معصوموں کے قتل عام سے اسلام اور دعوت اسلامی کی تضحیک، استہزاء اور تذلیل میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔

اس صورت حال کا استحصال وہ قوتیں کرتی ہیں جو مسلمانوں کو بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتیں۔ ۲۰ رمئی ۲۰۱۶ء کے روزنامہ انقلاب نے صفحہ

۱۵؍ پر ملیالم زبان میں ایک پوسٹر شائع کیا ہے، جس کا آغاز عربی میں تحریر 'السلام علیکم' کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ کسی نامعلوم بلاگر کی اس پوسٹ میں مسلمانوں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ ''جہاد کے راستے کو اختیار کرتے ہوئے ملک کے آئین کو تسلیم نہ کریں''۔ خبر کے مطابق کیرلا پولیس نے اس نامعلوم بلاگر کی تلاش شروع کردی، جس کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ دہشت گرد تنظیم داعش کا حامی ہوسکتا ہے، تاہم نہ صرف پولیس اس بلاگر کا پتہ لگانے میں ناکام رہی، بلکہ اب تک یہ بھی واضح نہیں ہوسکا کہ اب تک اس پوسٹ کو شائع کرنے والے کا اصل مذہب کیا ہے؟ بلاگر نے اس پوسٹ میں داعش کے نام نہاد خلیفہ ابوبکر بغدادی سے وفاداری کا اعلان کیا ہے اور مسلمانوں پر زور دیا ہے کہ وہ ہندوستان کے آئین کو تسلیم نہ کریں۔ بلاگر نے مزید لکھا ہے کہ خلافت کا حصول قتل و غارت گری سے ہی ممکن ہے اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین واحد رشتہ جنگ کا ہے۔ نامہ نگار لکھتا ہے کہ مختلف سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر ان دنوں مسلمانوں سے منسوب اس طرح کی پوسٹس کا خوب پروپگنڈا کیا جا رہا ہے، جس کا مقصد مسلمانوں کو بدنام کرنا اور انھیں انتہا پسند اور دہشت گردی کو فروغ دینے والی قوم کے طور پر لعن طعن کرنا ہے۔

سوشل ویب سائٹس پر اس طرح کی پوسٹس آئے دن کا معمول بن چکی ہیں۔ غالب گمان ہے کہ ان کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنا ہے، مگر کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ عالمی سطح پر مسلمانوں میں بعض ایسے طائفے پیدا ہو چکے ہیں جو تمام غیر مسلم دنیا کو دشمن اور معاند قرار دے کر ان سے جنگ کرنے کو اسلام اور دعوت اسلامی کا تقاضا سمجھتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ عام انسانوں سے تعامل کی قرآنی بنیاد حسن سلوک اور عدل و انصاف ہے نہ کہ عداوت ونفرت۔ سورۂ الممتحنہ کی آیات ۸۔۹ اس باب میں فیصلہ کن ہیں۔ آیت آٹھ (۸) میں صراحت ہے کہ جو غیر مسلم تمھارے ساتھ عداوت نہیں برتتے، انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ تم بھی ان کے ساتھ عداوت نہ برتو، بلکہ تم ان

کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ آیت نو (۹) میں مزید صراحت ہے کہ کفار سے ترکِ تعلق کا جو حکم اس سورہ کی ابتدائی آیات میں دیا گیا ہے اس کی وجہ ان کا کفر نہیں، بلکہ اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ ان کی عداوت اور ان کی ظالمانہ روش ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ان آیات کی بہترین تشریح اس واقعہ کو قرار دیا ہے جو سیرت و تاریخ کی کتابوں میں حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ اور ان کی کافر ماں سے متعلق بیان ہوا ہے۔ بخاری، مسلم اور مسند احمد میں یہ واقعہ مروی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی ایک بیوی قتیلہ بنت عبد العزی کافر تھیں اور ہجرت کے بعد مکہ ہی میں رہ گئیں تھیں۔ حضرت اسماءؓ ان ہی کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب مدینہ اور مکہ کے درمیان آمد و رفت کا راستہ کھل گیا تو وہ بیٹی سے ملنے کے لیے مدینہ آئیں اور کچھ تحائف بھی لائیں۔ حضرت اسماءؓ کی اپنی روایت ہے کہ میں نے جا کر رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: کیا میں اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کر سکتی ہوں؟ آپؐ نے جواب دیا: ''ہاں! ان سے صلہ رحمی کرو۔ حضرت اسمائؓ کے صاحب زادے عبد اللہ بن زبیرؓ اس واقعہ کی مزید تفصیل یہ بیان کرتے ہیں کہ پہلے حضرت اسمائؓ نے ماں سے ملنے سے انکار کر دیا تھا، بعد میں جب اللہ اور اس کی رسول کی طرف سے اجازت مل گئی تب وہ ان سے ملیں۔ ۳۹؎

قرآن کریم نے تو یہاں تک ہدایت دی ہے کہ دشمن قوم اگر ظلم و زیادتی کرے تو بھی اس کے جواب میں مسلمانوں کو ناروا ظلم کا راستہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں سب کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے:

وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ أَن صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَن تَعْتَدُواْ وَتَعَاوَنُواْ عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلاَ تَعَاوَنُواْ عَلَى الإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدۃ: ۲)

''اور (دیکھو)، ایک گروہ نے جو تمھارے لیے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمھارا غصہ تمھیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان

کے مقابلہ میں نا روا زیادتیاں کرنے لگو۔ (نہیں) جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں، ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ زیادتی کے کام ہیں، ان میں کسی سے تعاون نہ کرو''۔

اسی سورہ میں آگے اللہ نے حکم دیا ہے کہ دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف کرو اس لیے کہ تقویٰ اور خدا ترسی کا تقاضا یہ ہے کہ دوست دشمن سب کے ساتھ عدل و انصاف کیا جائے:

وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلاَّ تَعْدِلُواْ اعْدِلُواْ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى (المائدۃ: ۸)

''کسی گروہ کی دشمنی تمھیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے''۔

اسلامی تحریکیں غیر مسلموں سے انسانیت نواز اور ہمدردانہ تعامل کی ناگزیریت محسوس کرنے لگی ہیں۔ ادھر پچھلے دنوں عالمی سطح پر تشدد اور دہشت گردی کے جو ناخوش گوار اور ہول ناک واقعات کے پیش آئے ہیں اور پورے مغرب میں اسلاموفوبیا کی جو لہر پھیلی ہے، اس نے خاص طور پر سے مسلم تحریکوں کو اپنی پالیسی و پروگرام پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ان کے علمائ، دانش ور، مصنف اور سماجی کارکن سب محسوس کرنے لگے ہیں کہ دشمن اور غیر دشمن میں تفریق کی جائے۔ جارحیت پسند حکومتوں، افراد اور اداروں کی تمام تر سازشوں کے باوجود عام انسانوں سے معاشرتی روابط بڑھائے جائیں اور ان سے سماجی تعلقات میں بہتری لائی جائے۔

۷ رجنوری ۲۰۱۵ء کو پیرس میں چارلی ہیبڈو میگزین کے دفاتر میں خود کش بندوق برداروں نے حملہ کر کے اس کے دس کارکنوں اور دو پولیس جوانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کی وجہ اس مزاحیہ رسالے میں رسول اللہ ﷺ کے توہین آمیز خاکوں کی اشاعت کے ذریعے اسلام اور پیغمبر اسلام کو بدنام کرنے کی سازش بتائی گئی۔ اس تشدد آمیز کارروائی کی دنیا کے تمام مسلمانوں نے مذمت کی۔ ۴۲ پیرس کے مسلمانوں نے فوراً ملک سے محبت اور آئین فرانس کے سے اپنی

وفاداری کا اعلان کیا۔ ۷ر اپریل ۲۰۱۵ء کو Le Bourget سالانہ اجلاس میں وہاں کے مسلمان رہنماؤں نے جہادی جماعتوں کے اس فعل کو نفرت انگیز قرار دیا۔ عمر والاصفر اتحاد اسلامی تنظیمات برائے فرانس نے اخبارات کو جاری کردہ بیان میں کہا: ''ہم اپنے ملک فرانس کے تئیں وفادار ہیں۔ ہم اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ ہم اپنے رسول سے عشق کرتے ہیں، مگر ہم فرانس سے بھی محبت کرتے ہیں''۔

یہ ادراک وقت کی ضرورت ہے۔ اسلامی تحریکیں ان فکری وعلمی مسائل کو اپنی ترجیحات میں شامل کرلیں تو امت مسلمہ کا مستقبل درخشاں ہے۔ ہندوستان کی اسلامی تحریکوں کو یہاں کی غیر اسلامی قوتوں سے اشتراک عمل کی ضرورت کا احساس ہے۔ یہ ایک خوش آئند پہلو ہے۔ خدمت خلق سے اس کی بڑھتی ہوئی دل چسپی، ملکی تعمیر وترقی کے پروگراموں میں ہندوؤں سے تعاون وتعامل میں اضافہ ہوا ہے۔ ضرورت ہے کہ کارکنوں کے اندر اس کی ناگزیریت کے احساس میں اضافہ کیا جائے اور عبادت وخدمت کے لزوم کے تصور کو ان کے دلوں میں جاگزیں کیا جائے۔ دوسرے ملکوں میں کام کرنے والی اسلامی تحریکیں بھی اس جانب پیش رفت کر رہی ہیں، کہیں حالات کے دباؤ میں تو کہیں منصوبہ بندی کے تحت۔ ضرورت ہے کہ اس انسانیت نواز تعامل کی مؤثر تفہیم وتشریح ہو اور شرعی استدلال کے ساتھ دلوں کو اس پر مطمئن کیا جائے۔ یہ مرحلہ مشکل تو ہے، مگر ناقابل عبور نہیں ؎

آئین نو سے ڈرنا، طرز کہن پر اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

حواشی ومراجع

۱۔ صدیقی، ڈاکٹر نجات اللہ، اسلامی نہضۃ ثانیہ کی راہ، مرکزی کتبہ اسلامی دہلی، اکتوبر ۱۹۷۴ئ، ص ۱۶۶

۱۔ بہی الخولی، تحریک اور دعوت، اردو ترجمہ، عبید اللہ فہد فلاحی، دی ہولی قرآن پبلشنگ ہاؤس، بیروت ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ئ، ص ۶۸

۳۔ حوالۂ سابق، ص ۷۰

۴۔ حوالۂ سابق ص، ۳۳۹۔ ۳۴۰

۵۔ حوالۂ سابق، ۴۰۴

۶۔ جدید تعلیم گاہوں سے دینی و تعلیمی اداروں کے اشتراک کی ناگزیریت کے لیے دیکھیے راقم کا مضمون 'بدلتے ہوئے حالات میں مدارس اسلامیہ کی ترجیحات'۔ ماہ نامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، جلد ۳۵، شمارہ ۴، ص ۳۶

۷۔ مابعد مودودیت (Post-maududism) کی اصلاح جناب حسن الامین (پیدائش مردان پاکستان) نے اپنے مقالہ میں استعمال کی ہے جو انھوں نے ۲۰۱۰ء میں ارسمس یونی ورسٹی روٹرڈم نیوذی لینڈ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے جمع کیا تھا۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا، From islmaism to post-islmaism , A study of a new intellectual Discourse on islam and modernity in pakistan

حسن الامین کا تجزیہ یہ ہے کہ پاکستان میں 'مابعد اسلامیت' کا بھرتا ہوا نیا ڈسکورس اسلام پسندی یا اسلامی فکر کے خلاف نہیں ہے۔ نہ اسے پوری طرح سیکولر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس نئے علمی رجحان میں اسلامی ریاست، جہاد اور عالمی اسلامی نظام کا قیام جیسے موضوعات کی جگہ بنیادی حقوق، وسیع المشربی اور انفرادی آزادی وغیرہ پر زیادہ زور دیا گیا ہے، اس لیے اسے 'مابعد اسلامیت' کہا گیا ہے مگر حسن الامین اسے 'مابعد اسلامیت کی جگہ 'مابعد مودودیت' کہنا زیادہ بہتر تصور کرتے ہیں، بطور خاص پاکستان کے سیاق میں۔ راقم کی رائے ہے کہ یہ ساری اصطلاحات ایک فری ابہام کے سوا کچھ بھی نہیں۔

۸۔ حسینی، سید سعادت اللہ، تحریک اسلامی اور فکری چیلنج، ماہ نامہ عالمی ترجمان القرآن لاہور، جلد ۵، عدد ۱۲، ربیع الاول، ۱۴۳۷ھ/دسمبر ۲۰۱۵ئ، ص ۸۴۔ انھوں نے تحریک اسلامی کے حلقوں کو دعوت احتساب دی ہے۔ ان کے بقول دنیا کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کے پاس کوئی ڈھنگ کا 'تصور جہاں' (ورلڈ ویو) نہیں ہے، جہاں سے کار آمد آئیڈیاز پیدا ہوسکیں۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے پاس ورلڈ ویوز ہیں لیکن آئیڈیاز نہیں ہیں۔

۹۔ مودودی، سید ابو الاعلی، ''اسلامی ریاست۔ فلسفہ نظام کار اور اصول حکم را''، ترتیب: خورشید احمد، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور

۱۰۔ حوالۂ سابق، ص، ۴۸۰۔ ۴۸۱ سید مودودیؒ کے علی الرغم جماعت اسلامی ہند کے ایک معتبر دانش ور ڈاکٹر فضل الرحمن فریدیؒ نے جمہوریت کو حاکمیت الٰہ کے انکار کی بنیاد نہیں مانا ہے، بلکہ اسے اصلاً ملوکیت، ڈکٹیٹر شپ اور جبر و استحصال کا متصادم قرار دیا ہے۔ انھو نے لکھا ہے کہ: ''یہ موقف کہ جمہوریت فی نفسہ طاغوت ہے، حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ سیکولرزم اس جمہوریت کی صفت بن سکتا ہے اور اس وقت اس صفت کو ہمارے ملک نے بھی اختیار کر لیا

ہے، لیکن یہ نظام عوام کے فیصلے اور اختیار سے مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں جمہوری خلافت بھی بن سکتا ہے''۔ 'ملاحظہ کیجیے، فریدی، فضل الرحمن، اقامت دین کا سفر۔ ہندوستانی تناظر میں'، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، نومبر ۱۹۹۷ئ، ص ۴۹

۱۱۔ سید، قطب، معالم فی الطریق، دارالشروق، بیروت ۱۹۶۸ئ، ص ۱۲۸۔ حوالۂ سابق، ص ۹

۱۳۔ سید قطب کی خدمات و افکار کو تفصیل سے سمجھنے کے لیے دیکھیے، عبیداللہ فہد فلاحی اور محمد صلاح الدین عمری، 'سید قطب شہیدؒ۔ حیات و خدمات'۔ منشورات، منصورہ، لاہور، ۱۹۹۹ئ، صفحات ۴۰۰

۱۴۔ اخوان المسلمون کے افکار اور قربانیوں کی تاریخ جاننے کے لیے مطالعہ کیجیے راقم کی کتاب، 'اخوان المسلمون۔ تزکیہ، ادب، شہادت' القلم پبلیکیشنز سری نگر، ۲۰۱۱ئ، صفحات، ۳۰۲

۱۵۔ حوالۂ سابق، ص ۱۰۔۱۶

۱۶۔ الہضیبی، حسن بن اسماعیل، دعاۃ لاقضاۃ۔ ابحاث فی العقیدۃ الاسلامیۃ و منہج الدعوۃ الی اللہ، دارالطباعۃ والنشر الاسلامیۃ، قاہرہ، ۱۹۷۷ئ، ص ۵۔ کتاب کے ناشر کی وضاحت۔

۱۷۔ فریدی فضل الرحمن، تکثیری معاشرہ اور ہمارا مطلوبہ رویہ، ترجمانی: عرفان وحید، ماہ نامہ رفیق منزل نئی دہلی، جلد ۲۶، شمارہ: ۱۰۔ اکتوبر ۲۰۱۳ئ، قسط پنجم، ص ۲۸۔ انھوں نے پرہیزگاری کے اس موہوم تصور پر تنقید کی ہے جس کے تحت مسلمانوں کا ایک طبقہ انسانوں کی تکلیفوں کا سدّ باب کی چھوٹی کوششوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ اگر اللہ پر ایمان نہ لانے کی بنیادی برائی کو ختم کر دیا جائے تو تمام انسانی مصائب خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر فریدی کہتے ہیں: ''شریعت کی یہ تعبیر یکسر غیر مطلوب اور تنگ نظری پر مبنی ہے۔ یہ سوچ انفرادی و اجتماعی معاشرتی تبدیلی کے محرکات کے عدم فہم کی بھی چغلی کھاتی ہے۔'' حوالۂ سابق، ص ۲۹

۱۸۔ Rashid al Ghannushi, The Participation of a Islamist in a Non-Islmaic Government, power sharing Islam, liberty, for Muslim World Publication, London, 1993, pp, 51.63

۱۹۔ حوالۂ سابق، ص ۶۵

۲۰۔ ابن ہشام، ابومحمد عبدالملک، سیرت النبی ﷺ، تحقیق: محمد محی الدین عبدالمجید، دارالفکر، القاہرہ، ۱۹۳۷ئ، الجزء الاول، ص ۳۴۳

۲۱۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ، سیرت سرور عالم، ادارۂ ترجمان القرآن لاہور، مرتبین: نعیم صدیقی،

عبدالوکیل علوی، اشاعت سوم، دسمبر، ۱۹۸۰ئ، جلد اول، ص ۲۰۵۔۲۰۶

۲۲۔ راشد الغنوشی، حوالۂ سابق، ص ۵۸

۲۳۔ اصلاحی سلطان احمد، 'مسلم اقلیتوں کا مطلوبہ کردار، فکر و آگہی، اعظم گڑھ، طبع دوم ۱۴۲۳ھ/ ۲۰۰۲ئ، ص ۱۰۱ ۲۴۔ حوالۂ سابق، ص ۱۰۲ ۲۵۔ حوالۂ سابق، ص ۱۳۰

۲۶۔ حوالۂ سابق، ۱۵۰

۲۷۔ حوالۂ سابق، ص ۱۵۰۔ ۱۵۷، تکثیری معاشرہ میں مسلمانوں کے کردار کے موضوع پر ایک عالمانہ تحقیق معروف سیرت نگار پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی نے پیش کی ہے۔ مکی اسوۂ نبوی ﷺ، مسلم اقلیتوں کے مسائل کا حل، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، اپریل ۲۰۰۵ئ، ص ۱

۲۸۔ محمد ابو شقہ، عبد الحلیم، تحریری المرأۃ فی عصر الرسالۃ، کویت، دار القلم، ۱۹۹۰ئ، ۶/ جلدیں۔ اردو ترجمہ، خواتین کی آزادی عہد رسالت میں۔ تلخیص احمد کبیبی، مترجم: شعبہ حسنین ندوی، المعہد العالی للفکر الاسلامی، ہیرنڈن، ورجینیا، ص ۱۴

۲۹۔ حوالہ سابق، ص ۱۵ ۳۰۔ حوالۂ سابق، ص ۲۲۔ ۲۴

۳۱۔ محمد، الغزالی، الدعوۃ الاسلامیہ تستقبل قرنھا الخامس عشر، اردو ترجمہ، عبید اللہ فہد فلاحی، بہ عنوان، دعوت اسلامی، پندرھویں صدی ہجری کے استقبال میں، ہندوستان پبلی کیشنز دہلی، ۱۹۸۱ئ۔ ص ۸۰۔ ۸۳

۳۲۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب خروج النساء الی المساجد اذا لم یرتب علیہ فتنۃ، حدیث نمبر، ۴۴۲

۳۳۔ الغزالی محمد، حوالہ بالا، ص ۸۲

۳۴۔ فریدی فضل الرحمن، 'اقامت دین کا سفر' حوالہ بالا، ص ۱۷۱ ۳۵۔ حوالۂ سابق، ص ۷۹

۳۶۔ حوالۂ سابق، ص ۸۱ ۳۷۔ حوالۂ سابق، ص ۸۲۔ ۸۳ ۳۸۔ حوالۂ سابق، ص ۸۴،

۳۹۔ مودودی، سید ابو الاعلیٰ، تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۸۸ئ، جلد پنجم، ص ۴۳۳، حاشیہ ۱۳

۴۰۔ فلاحی عبید اللہ فہد، چارلی ہیبڈ و کے خاکے اور مسلمانوں کا ردعمل'، مشمولہ در، فکر محمد ﷺ، ترتیب: عبید اللہ فہد اور ضیاء الدین فلاحی، سیرت کمیٹی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، ۲۰۱۶ئ، ص ۱۶۷۔ ۱۹۷

41. http://mirajnews.com/international/europel. french_muslim_right_dominate_le_lourget

تعارف وتبصرہ

اِقسام الاَیمان فی اقسام القرآن ڈاکٹرف۔عبدالرحیم

ناشر: دار القلم ۔ پوسٹ بکس: ۴۵۲۳، دمشق،سنہ اشاعت ۲۰۱۶ءصفحات:۱۲۶، قیمت درج نہیں ہے۔

زیرنظر تصنیف محترم ڈاکٹرف،عبدالرحیم کی تازہ ترین پیش کش ہے۔آپ کی شخصیت عربی زبان سے تعلق رکھنے والوں کے لیے محتاجِ تعارف نہیں ہے۔آپ ایک درجن سے زیادہ عالمی زبانوں کے ماہر ہیں۔آپ کی کتاب 'دروس **اللغة العربية لغير الناطقين بها**' کوغیرعربوں کوعربی زبان کی تعلیم کے لیے دنیا کا مقبول ترین کورس مانا جاتاہےاورمتعددمما لک میں یہ کتاب داخل نصاب ہے۔

ڈاکٹرف،عبدالرحیم کا نظریہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی زبان کی تعلیم کے لیے خود قرآن مجید سے بہتراور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔آپ نے عملاً اسے اپنی کئی کتابوں میں پیش کیا ہے۔اس کا آغاز 'المسعف فی اللغة واعراب سورة یوسف' سے ہوتا ہے،جوعربی میں ہے۔اس کے بعد Selections from the glorious Quran، نورعلی نور، سورة الحجرات، اثا قلتم، وقل لھما قولاً کریماً اور At the well of Madyan ہیں۔ یہ سب انگریزی میں ہیں۔ زیرنظر تصنیف بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے،لیکن اس سے ذرا سا مختلف۔ سابقہ کتابوں میں جہاں آپ نے منتخب سورتوں یا آیتوں کے ضمن میں وارد قرآن مجید کے مختلف لسانی پہلوؤں اوراسالیب کامطالعہ کیا ہے، وہیں اس کتاب میں ایک خاص اسلوب کی ساری آیتیں جمع کر کے اس کی روشنی میں اس کا مطالعہ وتجزیہ کیا ہے۔اس اسلوب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بقول مؤلف قرآن مجید کی ایک سو چودہ (۱۱۴) سورتوں میں سے اسی (۸۰) سورتوں اور تقریباًچارسو (۴۰۰) آیتوں میں یہ اسلوب پایا جاتا ہے۔اسی لیے عرب وعجم کے قدیم وجدید محققین کے غوروفکر کا خاص موضوع رہاہے اوراس پر ان کی تالیفات موجود ہیں۔

زیر نظر تالیف چار حصوں پر مشتمل ہے: پہلے حصے میں مصنف نے اسلوبِ قسم کے احکام و مسائل بیان کیے ہیں، دوسرے میں اسلوب پر مشتمل تمام آیتیں یکجا کر دی ہیں، تیسرے حصے میں قسم اور چوتھے میں جوابِ قسم پر مشتمل آیتوں کو مختلف پہلوؤں سے تقسیم کیا گیا ہے۔ کتاب میں ہر بات نقد و تحقیق اور حوالوں کے ساتھ کہی گئی ہے اور اس سلسلے میں ماہرینِ زبان کے علاوہ مفسرین کرام اور علوم قرآن کے ماہرین کی تصنیفات سے نہ صرف بھر پور استفادہ کیا گیا ہے، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے مباحث کا خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے۔

کتاب کی طباعت و اشاعت دار القلم دمشق نے کی ہے، جو مؤلف ہی کی طرح علمی اور طباعتی حلقوں میں اپنے معیار کے معاملے میں ایک منفرد اور ممتاز مقام کی حامل ہے۔ امید ہے یہ کتاب نہ صرف عربی زبان سیکھنے والوں کے لیے ایک بیش قیمتی تحفہ ثابت ہوگی، بلکہ قرآن مجید کے زبان و بیان سے دل چسپی رکھنے والے ماہرین بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ (الطاف احمد مالانی)

معرفۃ الحرام فی شریعۃ الاسلام — محمد اسعد اعظمی

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی، ۲۰۱۶ء، صفحات: ۲۷۲، قیمت: ۳۰۰ روپے

شریعتِ اسلامی میں حلال وحرام کا مسئلہ بہت اہم اور نازک ہے۔ اس کا تعلق انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں سے ہے۔ خورد ونوش، لباس، معاملات، بیع و شرا، کسبِ معاش، غرض زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس میں ایک مسلمان کو حلال وحرام سے متعلق واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہو۔

زیرِ نظر کتاب میں انسانی زندگی میں کثرت سے پیش آنے والے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ جدید مسائل کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کے مصنف مولانا مفتی محمد اسعد اعظمی 'حلال انڈیا چنّئی' (جو حلال سرٹیفکٹ دینے والا ایک ادارہ ہے) کے شریعہ بورڈ میں بہ حیثیت مفتی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے: باب اوّل 'شریعت میں حلال وحرام' کے

عنوان سے ہے۔ اس میں حلال کی اہمیت وفضیلت بیان کی گئی ہے اور حرام کی نحوست اور اس پر ملنے والے عذاب کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ باب دوم میں تجارت: خرید وفروخت اور شرکت ومضاربت کے فضائل ومسائل زیرِ بحث آئے ہیں۔ اس سیاق میں اگلے تین ابواب (سوم، چہارم، پنجم) میں سود، جوا، فکسڈ ڈپازٹ، انشورنس، رشوت، غصب اور چوری کی حرمت اور مذمّت بیان کی گئی ہے اور ان سے متعلق بہت سے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ چھٹا باب 'اجارہ' کے لیے خاص ہے۔ اس میں اس سے متعلق مختلف مسائل اور ان کے احکام سے بحث کی گئی ہے۔ ساتویں باب میں نشہ آور اشیاء کا حکم اور ان سے متعلق مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ آٹھویں باب میں حلال وحرام حیوانات کا بیان ہے اور مسائلِ ذبح کی وضاحت کی گئی ہے۔ نویں باب میں ذبیحہ کے علاوہ دیگر حرام ومکروہ ماکولات مذکور ہیں اور دسواں باب احکامِ لباس سے متعلق ہے۔

فاضل مصنف نے مسائل کے بیان میں آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی سے استدلال کیا ہے اور فقہ وفتاویٰ کی کتابوں سے بھی مدد لی ہے اور ان کے حوالے دیے ہیں۔ کتاب میں تقریباً ایک سو ستّر (۱۷۰) مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ ابتدا میں نو (۹) علمائے کرام اور اصحابِ افتا (جن میں سے بعض مؤلف کے اساتذہ ہیں) کی تقریظات شامل کی گئی ہیں، جن میں ان کی محنت اور عرق ریزی کی تحسین اور بیانات کی تصویب وتوثیق کی گئی ہے۔

امید ہے، اس کتاب کو علمی ودینی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہوگی اور اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔ (محمد رضی الاسلام ندوی)

تصوف کی حقیقت

پروفیسر مقصود احمد

ناشر: حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر، احمد آباد، گجرات، ملنے کا پتہ: ۲۰۳۔ شفا کمپلکس، گندلج روڈ، بروڈہ، گجرات۔ ۳۹۰۰۲۰۔ صفحات: ۱۲۸، قیمت: ۱۲۰ روپے۔

تصوف کی تاریخ، عقائد، ماہیت، ارکان، اجزائے ترکیبی اور ارتقاء سے متعلق

مختلف زبانوں میں بہت سی تصانیف موجود ہیں۔ زیر نظر کتاب بروڈہ یونی ورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر مقصود احمد کی تالیف ہے۔ یہ اصلاً ایک سمینار میں پیش کیا گیا مقالہ ہے، جسے بعد میں پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر، احمد آباد سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔

کتاب میں حرفِ آغاز اور تمہید کے علاوہ آٹھ (۸) ابواب کے تحت تصوف کی تعلیمات پر اعتراضات کا تجزیہ، لفظ صوفی کے اشتقاق کا جائزہ، صوفی کی تعریف، تصوف کے مآخذ اور اس کی اساس، وصول الی اللہ کا مطلب اور اس کے حصول کا طریقہ، دیدار الٰہی سے متعلق بحث، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود، مرشد کامل کی ضرورت جیسے موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔

تمہید میں مصنف نے تصوف کی تعریف، اس کے بنیادی خدو خال اور معروف صوفیہ کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر 'تصوف کی تعلیمات پراعتراضا عنوان سے بعض اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ 'تصوف نہ تو قرآن کی اصطلاح ہے نہ قرآن وحدیث میں یہ لفظ وارد ہوا ہے۔ اس کا جواب مصنف نے یہ دیا ہے کہ اسلامی علوم میں بہت سی ایسی اصطلاحیں وارد ہوئی ہیں جو اسلام کے دور اول میں رائج نہیں تھیں، بلکہ کافی عرصے کے بعد وجود میں آئیں، لیکن انھیں بدعت قرار نہیں دیا گیا۔ یہی معاملہ تصوف کی اصطلاح کے ساتھ ہونا چاہیے۔ (ص ۱۹)

تصوف میں رہبانیت کا عنصر پایے جانے کے متعلق مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ مابعد زمانوں میں بعض متصوفین کے غیر محتاط رویے کے بنا پر کچھ ایسی نامناسب رسمیں ضرور در آئی ہیں اور کچھ ایسے ناروا عناصر داخل ہو گئے ہیں جو قابل اعتراض و مذمت ہیں''۔ (ص ۲۰)

ایک باب میں مصنف نے لفظ 'صوفی' کے اشتقاق سے بحث کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ محققین نے مختلف الفاظ کو اس کا مشتق قرار دیا ہے، مثلاً صفا (پاکیزگی) صفۃ (چبوترہ) صف (قطار) صفوۃ (گدی کے بال) صوفانہ (ایک قسم کا پودا) صوفہ

(ایک قبیلہ کا نام) صوف (اون) وغیرہ۔ پھر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اصلاً لفظ 'صوف' ہی صوفی کا مشتق ہے (ص ۲۸) جب کہ مشہور صوفی امام قشیریؒ (۳۷۶۔ ۴۶۵ھ) نے اس اشتقاق کو صراحت سے غلط ٹھہرایا ہے۔ (ملاحظہ کیجیے: رسالۂ قشیریہ، مترجم: ڈاکٹر محمد پیر حسن، ادارۂ تحقیقات اسلامی لاہور، ۱۹۸۸ئ، ص ۵۰۹)

ایک جگہ فاضل مصنف نے 'دیدار الٰہی' سے بحث کی ہے۔ اس میں انھوں نے کھینچ تان کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس دنیا میں صوفیہ کو دیدار الٰہی ممکن ہے۔ (ص ۶۲) اپنی رائے کی تائید میں انھوں نے مولانا انور شاہ کشمیری، قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی کے اقوال پیش کیے ہیں۔ لیکن اس کے مقابل جن صحیح احادیث اور صحابہ کرامؓ سے مروی مستند راویتوں سے ان کا رد ہوتا ہے، انھیں درج کرنے سے گریز کیا ہے۔

اس بحث کے ضمن میں مصنف نے اللہ کے رسول ﷺ کے عبادت الٰہی میں مستغرق ہونے کا ایک من گھڑت اور موضوع واقعہ نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں: ''ایک بار آپؐ اپنے حجرۂ مبارک میں عبادت الٰہی میں مستغرق تھے۔ اس اثنا میں حضرت عائشہؓ تشریف لائیں اور حجرہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ سرور کونینؐ نے اندر سے فرمایا: کون؟ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: بنت ابی بکرؓ وزوجۂ محمد سید المرسلینؐ نے فرمایا: کون ابوبکر؟ کون محمد؟ تب حضرت عائشہؓ کو احساس ہو گیا کہ اس وقت حضور ﷺ عالم استغراق ومحویت میں ہیں، چناچہ وہاں سے واپس چلی گئیں۔ (ص ۶۴) واقعہ بیان کر کے وہ لکھتے ہیں کہ'' اس واقعے کا ماخذ ذہن میں نہیں ہے، اس لیے حوالہ پیش کرنے سے قاصر ہوں''۔ حیرت ہے کہ فاضل مصنف نے، جو علم وتحقیق کی دنیا سے وابستہ ہیں، کیسے بلاحوالہ یہ بے سروپا واقعہ درج کرنے کی ہمت کی؟

تصوف میں عشق کو بہت اہم مقام حاصل ہے۔ یہ عشق مرید کو اپنے پیر اور شیخ سے ہوتا ہے۔ عشق کی گرمی حاصل کرنے کے لیے صوفیہ نے مختلف قسم کے طریقے: سماع، جدال، راگ، موسیقی وغیرہ ایجاد کر لیے ہیں۔ مصنف نے بھی اپنے شیخ سے عشق

کی شدت کو بیان کرتے ہوئے ان کے ساتھ اپنی مجنونانہ کیفیت کے اتار چڑھاؤ کو بڑے فخریہ انداز میں بیان کیا ہے۔ (ص ۶)

مصنف کتاب، پروفیسر مقصود احمد بڑودہ یونی ورسٹی میں شعبۂ فارسی، عربی و اردو کے صدر ہیں۔ اسلامی علوم کے مختلف موضوعات پر ان کی ایک درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ امید تھی کہ اس موضوع پر وہ تحقیقی انداز میں لکھیں گے اور اسلامی تصوف کو غیر اسلامی تصوف سے الگ کر کے پیش کریں گے، لیکن افسوس، اس کتاب سے یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ (محمد اسعد فلاحی)

فکرِ اسلامی کا ارتقاء (ہندوستان کا خصوصی مطالعہ) ڈاکٹر ضیاء الدین ملک

ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی۔ ملنے کا پتہ: قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی، صفحات: ۲۳۰، قیمت: درج نہیں۔

زیر نظر کتاب میں فکر اسلامی کے تسلسل اور ارتقاء سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے مصنف ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی معتدل فکر کے حامل ہیں۔ ان کی تنقیدوں میں علمیت اور ایجابیت کا رنگ ہوتا ہے۔ علمی حدود اور جادۂ اعتدال سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔ ان کی یہی خصوصیت انہیں اہل علم کی صف میں شامل کرتی ہے۔ ان کے مزاج و تحریر میں صالحیت و نافعیت کا عنصر پایا جاتا ہے۔ ان کی اس نئی علمی کاوش میں بھی یہ خصوصیات نمایاں طور پر موجود ہیں۔ یہ کتاب اگر چہ مجموعۂ مقالات معلوم ہوتی ہے، مگر کوئی شک نہیں کہ اس میں بڑی حد تک تصنیفی ترتیب، ربط اور تسلسل پایا جاتا ہے۔

یہ کتاب پیش لفظ، تقریظ، سپاس گزاری، مقدمہ، چار ابواب، خلاصہ بحث، فکر اسلامی پر تحقیقات کا مختصر اشاریہ، نیز ماخذ و مصادر کی فہرست اور شخصیات کے اشاریہ پر مشتمل ہے۔

ابتدا میں ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی کی تقریظ شامل ہے۔ یہ تقریظ اس سوال پر تمام ہوتی ہے کہ ''اگر امتِ مسلمہ میں بحیثیت مجموعی اجتہاد کبھی نہیں رکا اور اگر اجتہاد بقول مصنف ہمیشہ معاشرتی ہوتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ امت مسلمہ متواتر زوال کی جانب جا رہی ہے؟'' اس کتاب میں اس سوال کا جواب بجا طور پر موجود ہے۔ راقم کے

نزدیک اس سوال کا جواب بہت مختصر ہے اور وہ ہے رجوع اِلی الاسلام من جدید۔ بقول علامہ شبلی نعمانی ''مسلمانوں کی ترقی کا راز اس میں مضمر ہے کہ وہ اپنے ماضی کی طرف پلٹیں اور اس طرح پلٹیں کہ قرون اولیٰ سے جاملیں''۔

فاضل مصنف نے اپنے مقدمہ میں اختصار اور وضاحت کے ساتھ فکر اسلامی کی تاریخ پر کلام کیا ہے۔ انھوں نے بجا طور پر کہا ہے کہ فکر اسلامی کی اصطلاح انیسویں صدی عیسوی میں خدا بے زار مغربی افکار کے ردعمل کے طور پر وضع کی گئی۔ انہوں نے فکر اسلامی اور علم کلام کے عنوان سے بھی جامع بحث کی ہے۔ اس ضمن میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید پر بھی کلام کیا ہے۔ یہاں ان سے اختلاف کی گنجائش پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''تشکیل جدید کی کاوشوں کو ہر زمانے میں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔'' راقم کے نزدیک یہ امر مسلم ہے کہ تجدید کے علم برداروں کو ہمیشہ ان کی تجدیدی کوششوں کا نتیجہ مثبت ملا ہے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہوا ہے جب ان کاوشوں پر قرآن وسنت کا عکس، سیرت کا پرتو اور صلحاء امت کے اجتہادات کی روشنی غالب رہی ہے۔ محض تفردات اور ایسے تفردات جو تجدد پسندی کا مظہر ہونے کے ساتھ قرآن وسنت سے متصادم ہوئے، خواہ وہ کسی کے ہوں، کسی زمانہ میں پنپ نہ سکے۔ اس ضمن میں مصنف نے مولانا مجیب اللہ ندویؒ کا ایک اقتباس نقل کیا ہے، جس کا ایک جملہ یہ ہے: ''...ان حضرات (مفتی محمد عبدہ، سرسید، محمد اقبال) کی کوششیں یا تو علماء کی قدامت پرست ذہنیت کی وجہ سے بارآور نہ ہوسکیں، یا لوگ ان کو سمجھ نہ سکے...'' اس عبارت نے راقم کو حیرت میں ڈال دیا، اس لیے کہ اس کی نسبت مولانا مجیب اللہ ندوی جیسے بڑے عالم دین کی طرف عجیب سی لگی۔ لیکن یہ حیرت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ راقم نے جب مولانا کے اصل مقالہ سے رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ جو اقتباس ڈاکٹر صاحب نے مولانا کی طرف منسوب کیا ہے، مولانا نے اس میں اپنی فکر نہیں پیش کی ہے، بلکہ تنقید کی غرض سے اس سیمینار کے ذمہ داروں کی فکر نقل کی ہے جس میں انہیں مدعو کیا گیا تھا، پھر اپنے پورے مقالے میں اسی فکر پر تنقید کی ہے۔

مقدمہ میں آگے موضوع کتاب کے دیگر پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں لکھا گیا ہے کہ یہ موضوع نیا اور اچھوتا ہے۔ اس کی جگہ اگر یہ لکھا جاتا کہ اس نام سے

کتاب نئی ہے تو زیادہ موزوں تھا۔ مواد تو اس موضوع پر خوب میسر ہے، تاریخ اصلاح و تجدید اور مفکرین امت سے متعلق بے شمار تحریریں ہیں جن میں سے بہت سی کتابوں کا اشاریہ خود لائق مصنف نے کتاب کے آخر میں مرتب کر دیا ہے، تاہم اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تنقیدی محاکمہ کو جگہ دی گئی ہے اور بیش تر نقد ایجابی و علمی ہے، البتہ اس سے انکار نہیں کہ کہیں انداز تجزیاتی ہے اور کہیں دفاعی، لیکن اچھوتے پن اور افادے سے خالی نہیں۔

باب اول میں فکر اسلامی کا تعارف پیش کیا گیا ہے، قرآن وسنت میں فکر اسلامی کی اساسیات پر مدلل انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے، فکر اسلامی کے عناصر سے بحث بھی اس باب کی زینت ہے۔ عناصر کی تعیین میں مصنف کی فکری بصیرت ابھر کر سامنے آئی ہے اور پھر ان عناصر پر گفتگو بہت علمی اور بصیرت افروز انداز میں کی گئی ہے۔ انہوں نے سات عناصر شمار کیے ہیں: مقصدیت کی تلاش، جامعیت کا فروغ، اسلامی تہذیب کی حمایت ومحافظت، اجتہادی بصیرت، معروضیت وعلمیت، نافعیت اور عصری حسیت وغیرہ۔ مصنف کی نظر میں یہ وہ بنیادی عناصر ہیں جن سے فکر اسلامی کی آبیاری ہوتی ہے۔ کیا خوب ہوتا کہ فکر اسلامی کے عناصر میں آں محترم 'دعوتی مزاج' کو جگہ دیتے اور اس کی علمی تشریح کرتے۔ فکر اسلامی کے بانی حضرت محمد ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی دعوت تھا۔ آپ کے تشکیل کردہ معاشرہ میں دعوتی مزاج کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ فکر اسلامی کے ارتقائی سفر میں اگر کہیں تعطل کا شبہہ ہوتا ہے تو اس کا سبب اس دور کے علماء اور اہل علم میں دعوتی مزاج کا فقدان ہی نظر آتا ہے۔ بہر حال الفاظ کا قالب تبدیل ہو سکتا ہے، مگر واقعی یہی وہ عناصر ہیں جن سے فکر اسلامی کا غلبہ وارتقاء ممکن ہے۔ اس میں بھی جامعیت کے فروغ سے صورت حال پر قابو پانا، جزوی اختلافات سے صرف نظر کرنا اور اسلام کی آفاقیت کو بحال کرنا خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اسی سے نسلِ نو کا اسلام پر اعتماد بحال کرنا ممکن ہے۔ جامعیت سیرت رسول اور اسوۂ حسنہ کا امتیازی وصف ہے۔ صحابہ کرام کی زندگیاں اسی صفت کے باعث قابل رشک نظر آتی ہیں۔

باب دوم میں فکر اسلامی کا تاریخی پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے اولین

معماروں میں فقہاء و اصولیین، اسلامی عمرانیات کے مسلم مفکرین اور یونانی فکر کے اسلامی ناقدین پر گفتگو کی گئی ہے، اسی باب کی تیسری فصل میں تجدید واحیاء دین میں فکر اسلامی کے کردار اور اس کے عناصر کے ذریعہ کار تجدید کی انجام دہی سے بحث کرتے ہوئے تاریخی شہادتیں پیش کی گئی ہیں۔ باب سوم میں ہندوستان میں فکر اسلامی کے ارتقائی سفر کا مطالعہ کیا گیا ہے اور یہاں کے اہم اسلامی مفکرین اور ان کے افکار و آراء کا ناقدانہ تجزیہ کیا گیا ہے۔

باب چہارم میں ہندوستانی مسلم اقلیت کے عروج و استحکام میں فکر اسلامی کے کردار سے بحث کی گئی ہے، فکر اسلامی کی راہ میں مزاحم قوتوں اور رکاوٹوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور آخر میں مسلم مفکرین کی تحریروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ (انھوں نے جا بجا مسلمانوں کے لیے اقلیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ راقم کو اس سے اختلاف ہے) اس باب میں مصنف نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ اپنا حاصل مطالعہ پیش کیا ہے، البتہ متعدد مقامات پر تشنگی کا احساس باقی رہتا ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ ہندوستان میں فکر اسلامی کے ارتقاء وتحفظ کے ضمن میں دعوتی کوششوں پر تفصیلی بحث ہوتی اور ان کا ناقدانہ جائزہ لیا جاتا، مدارس اسلامیہ کے کردار پر مثبت روشنی ڈالی جاتی اور ان کا احتساب کیا جاتا، اس لیے کہ ہندوستان، بلکہ برصغیر میں فکر اسلامی کی حمایت وحفاظت اور اس کے ارتقاء میں مدارس کا کردار مسلم ہے، بحث وتحقیق کے مخصوص علمی مراکز بھی موضوع بحث بنتے، مزاحمتی قوتوں سے بحث کرتے ہوئے اس پہلو سے بھی غور کیا جاتا کہ اس ملک میں مسلمانوں کے زوال کی ایک وجہ دانش وروں کی مختلف فیہ 'دانش وری' ہے، ان کی جانب سے فکر اسلامی پر بحث کرتے ہوئے ان لادینی عناصر کا داخل کر دینا بھی ایک سبب ہے جن کا فکر اسلامی کی روح و تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔ راقم السطور کے نزدیک مزاحمتی طاقتوں کا ذکر کرتے ہوئے شیعیت سے بھی علمی بحث ہونی چاہیے، کیوں کہ میرے خیال میں یہ وہ قوت ہے جو ہمارے درمیان رہ کر بھی سب سے بڑی مزاحمتی قوت اور فکر اسلامی کی راہ میں ضرر رساں اور روڑا رہی ہے۔ تاریخی تسلسل اور عصری مشاہدات ثابت کرتے ہیں کہ اس مزاحم قوت کو فکر اسلامی کا غلبہ قطعاً منظور نہیں، بلکہ

سلطنت فارس کی عظمت وسطوت کی تشکیل جدید اس کا منشا ہے۔ مصنف نے روایتی مذہبیت کے ضمن میں اس جانب لطیف اشارہ کیا ہے، جب کہ یہ موضوع تفصیل کا طالب ہے۔ یہ بحث مصنف سے جزئی اختلاف کے ساتھ بڑی دل چسپ اور مبنی بر حقیقت ہے اور دعوت فکر وعمل دیتی ہے۔ باوجود اس کے کہ اس کی ابتدائی سطریں اپنے ابہام وغموض کے سبب منفی فکر کی حامل نظر آتی ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جس روایت پرستی کا موصوف نے ذکر کیا ہے، اس سے ہمارے ناقص مطالعہ و مشاہدے کی حد تک بہت کم لوگ دامن بچا پاتے ہیں۔ ہماری مرجعیت کا محور صدی دوصدی کے اجتہادات ونظریات اور تحریکات کے بانیان ہی قرار پاتے ہیں۔ ان ہی کے نظریات کے دفاع میں ہماری فکری توانائیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ کاش ہم ان سے بچ بچا کر کبھی فکر اسلامی کے اولین حاملین کو اپنے فکر ونظر کا موضوع بناتے، وہیں سے روشنی حاصل کرتے اور اسی روشنی کو معیار بنا کر ماضی قریب کے مفکرین کے نظریات کو جانچتے، پرکھتے تو شاید اس جماعتی عصبیت سے نجات مل جاتی جس کی طرف فاضل مصنف نے اشارہ کیا ہے۔

حاصل بحث میں مصنف نے کتاب کا خلاصہ درج کر دیا ہے۔ اس سے ان کی عرق ریزی کا پتہ ملتا ہے، قوتِ تفکیر کو جلا ملتی ہے، غور وفکر کے نئے موضوعات سامنے آتے ہیں اور قوت عمل کو تحریک ملتی ہے۔ اس خلاصہ میں مصنف نے بعض ان موضوعات کا ذکر کیا ہے جو طوالت کے سبب شامل کتاب نہیں کیے گئے، یا کتاب کا مختصر حجم ان کا متحمل نہیں تھا۔ امید ہے، آئندہ ایڈیشن میں وہ ضرور قابلِ قدر اضافہ کریں گے۔

کتاب میں جا بجا پروف کی غلطیاں سخت تکلیف دہ ہیں۔ کتاب کی زبان علمی اور جا بجا ادبی ہونے کے ساتھ ثقیل بھی ہے۔ بسا اوقات اردو کو بوجھل کرنے والی غیر صحیح یا غیر فصیح لفظیات بھی مستعمل ہیں۔ بہر حال کتاب بہ حیثیت مجموعی قابل قدر، لائق استفادہ اور اپنے موضوع پر بھرپور و مدلل ہے۔ امید ہے کہ اہل علم اس سے استفادہ کریں گے اور اس سے ان کے فکر ونظر کو جلا ملے گی۔

(محمد طارق ایوبی ندوی)

خبر نامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۶۱)

☆ صدر ادارۂ تحقیق و امیر جماعت اسلامی ہند مولانا سید جلال الدین عمری کی تصنیفات کو الحمد للہ علمی و دینی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل ہورہی ہے۔ حال میں ان کی تصنیف 'اسلام۔ انسانی حقوق کا پاسبان' کا دیدہ زیب اور معیاری ایڈیشن، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ اس کتاب میں بنیادی انسانی حقوق کے بارے میں اسلام کی تعلیمات سے قرآن، حدیث اور فقہ اسلامی کی روشنی میں مدلل بحث کی گئی ہے۔ صفحات ۱۸۴، قیمت ۹۰/ روپے۔ بعض اور کتابچوں کے بھی نئے ایڈیشن منظر عام پر آئے ہیں: قرآن کا نظامِ خاندان، صفحات: ۳۲، قیمت ۲۲/ روپے۔ اسلام اور انسانی حقوق، صفحات ۲۴، قیمت ۱۸/ روپے۔ مولانا کا ایک نیا کتابچہ خاندان کی اصلاح اور اولاد کی تربیت کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ صفحات: ۳۲، قیمت: ۲۰/ روپے۔

☆ ۱۷/ ستمبر ۲۰۱۶ء کو ادارہ کے کانفرنس ہال میں 'ملک کی موجودہ صورت حال اور ہماری ذمہ داریاں' کے عنوان سے ایک اہم پروگرام منعقد ہوا۔ ابتدا میں جماعت اسلامی ہند کے نائب امیر جناب نصرت علی اور مرکزی سکریٹری جناب محمد احمد نے مذکورہ موضوع پر اظہار خیال کیا۔ اس کے بعد امیر جماعت مولانا سید جلال الدین عمری نے صدارتی خطاب فرمایا۔ اس پروگرام کی نظامت رکنِ ادارہ مولانا محمد جرجیس کریمی نے انجام دیے۔

☆ ملک میں گزشتہ دنوں مسلم پرسنل لا پر حملوں میں شدت آ گئی ہے اور اس پر طرح طرح کے اعتراضات کیے جا رہے ہیں۔ اس پس منظر میں معاون مدیر تحقیقات اسلامی، ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کے تین کتابچے مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز سے شائع ہوئے ہیں: قرآن مجید کی عائلی تعلیمات، صفحات: ۲۴، قیمت: ۲۰/ روپے، اسلام کے نظام وراثت میں عورت کا حصہ، صفحات: ۲۴، قیمت: ۲۰/ روپے، دارالقضاء ضرورت واہمیت اور کرنے کے کام، صفحات: ۲۴ قیمت: ۲۰/ روپے۔

☆ ۲۸/اگست ۲۰۱۶ء کو ادارہ کے کانفرنس ہال میں 'موجودہ دور میں مکی عہد نبویؐ کی معنویت' کے موضوع پر وفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی (سابق چیرمین شعبۂ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ) نے توسیعی خطبہ پیش کیا۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر سید مسعود احمد (سابق ڈین فیکلٹی آف لائف سائنسز علی گڑھ) نے کی۔ نظامت کے فرائض مولانا محمد جرجیس کریمی نے انجام دیے۔ آخر میں ادارہ کے سکریٹری ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی نے کلماتِ تشکر پیش کیے۔

☆ ۸/اگست ۲۰۱۶ء کو ادارہ کے اسکالرس کی انجمن 'رائٹرس فورم' ایک پروگرام ہو، جس میں ادارہ کے سابق اسکالر جناب مزمل کریمی فلاحی نے 'قرآنی قصے: اغراض و مقاصد' کے عنوان پر مقالہ پیش کیا۔ اس پروگرام کی صدارت پروفیسر سید مسعود احمد نے کی۔ انھوں نے مقالے پر اپنے تبصرے کے ساتھ تحقیق وتصنیف کے سلسلے میں مفید مشوروں سے بھی نوازا۔

☆ تحقیقات اسلامی کی مقبولیت کا مظہر یہ ہے کہ اس پر ملک و بیرون ملک کی کئی یونی ورسٹیوں میں تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ حال میں اطلاع ملی ہے کہ یونی ورسٹی آف سرگودھا پاکستان کے شعبہ اسلامیات میں جناب مدثر بشیر 'مجلہ تحقیقات اسلامی کے قرآنی مقالات کا تحقیقی جائزہ' کے موضوع پر ایم فل کا مقالہ تیار کر رہے ہیں۔

☆ شعبۂ حدیث و سیرت، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، پاکستان نے سیرت نبوی اور اس سے متعلق موضوعات پر علمی وفکری مباحث کو فروغ دینے کے مقصد سے 'سیرت اسٹڈیز' کے نام سے ایک اعلیٰ معیاری و تحقیقی سالانہ مجلہ نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجلہ کے ایڈیٹر محترم ڈاکٹر شاہ معین الدین ہاشمی نے خبر دی ہے کہ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کو اس کی مجلس مشاورت میں شامل کیا گیا ہے۔

☆ ادارہ کے تصنیفی تربیت کورس میں گزشتہ دنوں میں دو طلبہ (جناب اختر الاسلام ندوی اور جناب سراج الدین سلفی) نے داخلہ لیا ہے۔

فہرست مضامین سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ جلد ۳۵، ۲۰۱۶ء

مضامین	مضمون نگاران	شمارہ	صفحات
حرف آغاز			
مولانا شبلیؒ، امت مسلمہ اور دارالمصنفین	سید جلال الدین عمری	۱	۵۔۱۱
دعوتِ دین کے اصول وآداب	سید جلال الدین عمری	۲	۱۳۳۔۱۴۲
صلاحیتوں کو پہچاننے اور ترقی دینے کی ضرورت	سید جلال الدین عمری	۳	۲۶۱۔۲۶۷
اسلام کا فکری انقلاب اور دور حاضر کے تقاضے	سید جلال الدین عمری	۴	۳۸۹۔۴۰۱
تحقیق وتنقید			
شیخ محمد عبدہ کی تجدیدی فکر کے بنیادی خدوخال	حافظ عقیل احمد قریشی	۱	۱۳۔۲۶
حسن البیان فی مافی سیرۃ النعمان۔ مطالعہ وتجزیہ	ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی	۱	۲۷۔۴۹
صوفیانہ تفسیری رجحان کا ارتقائ	حافظ محمد احسن رضا	۲	۱۴۳۔۱۵۱
اسلامی ریاست میں ادارۂ احتساب	مولانا محمد جرجیس کریمی	۲	۱۵۳۔۱۶۸
امیر خسرو کی تصنیف، خزائن الفتوح (ثقافتی ومعاشرتی مطالعہ)	ڈاکٹر محمد امین عامر	۲	۱۶۹۔۱۷۵
شبلی کی سیرت نگاری کا تنقیدی جائزہ	پروفیسر محمد انس حسان	۳	۲۶۹۔۲۹۲
فیوض الحرمین۔ ایک مطالعہ	مولانا کلیم صفات اصلاحی	۳	۲۹۳۔۳۰۴
حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات امن	ڈاکٹر تنویر قاسم	۴	۴۰۳۔۴۲۰
مصر میں آزادی نسواں کی تحریک	ڈاکٹر جاں نثار معین	۴	۴۲۱۔۴۴۰
بحث ونظر			
میڈیکل انشورنس سے متعلق فقہی اکیڈمیوں کے فیصلے اوران کا تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر امتیاز احمد	۱	۵۱۔۶۶
اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ۔ اسلام کا نقطۂ نظر	مولانا محمد قمر الزماں ندوی	۲	۱۷۷۔۱۹۹
معاشی فلاح وبہبود کا اسلامی تصور	ڈاکٹر سعدیہ گلزار	۲	۲۰۱۔۲۱۶
مسلم دور حکومت کے علماء وصوفیہ اور دعوت دین	ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی	۳	۳۱۹۔۳۳۸
توحید خالص کا تصور۔ صحف سماوی میں	جناب محمد افضل	۳	۳۰۵۔۳۱۸
اسلامی ریاست میں مذہبی آزادی	ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی	۴	۴۴۱۔۴۶۲
اسلامی تحریکوں کی علمی وفکری ترجیحات	ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی	۴	۴۶۳۔۴۸۹

سیر وسوانح

امام ابوعمرو عبدالرحمن اوزاعی کا علمی مقام	مولانا اختر امام عادل قاسمی	۱	۶۷_۹۴
شیخ محی الدین ابن عربی اور ان کی تفسیر	پروفیسر توقیر عالم فلاحی	۲	۲۱۷_۲۲۹

ترجمہ وتلخیص

مغرب کو اسلام کا تحفہ	ڈاکٹر احمد وون ڈنفر مترجم: ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی	۱	۹۵_۱۰۶
مولانا فراہی کی تصنیف 'جمھرۃ البلاغۃ'	ڈاکٹر احمد مطلوب (بغداد) مترجم: ابوسعد اعظمی	۳	۳۳۹_۳۶۴

تعارف وتبصرہ

ارشاد التسلیم الی علوم حدیث النبی الکریم	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۱	۱۰۷_۱۰۸
نماز کے اختلافات اور ان کا آسان حل	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۱	۱۰۸_۱۱۰
امت مسلمہ: مشن اور خود شناسی	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۱	x_۱۱۰
سیرت طیبہ	جناب محمد اسعد فلاحی	۱	۱۱۱_۱۱۲
Empowerment of Islam....	ڈاکٹر محمد شہاب الدین	۱	۱۱۳_۱۱۵
اقبال اور دبستان شبلی	جناب محمد رضوان خان	۱	۱۱۵_۱۱۶
ماہ نامہ شمس الاسلام بھیرہ (مولانا امین احسن اصلاحی نمبر)	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۱	۱۱۶_۱۱۷
محمد ﷺ عصر حاضر کے پیغمبر	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۲	۲۳۱_۲۳۷
تہذیب وسیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۲	۲۳۸_۲۴۴
زندگی کا خزانہ	ڈاکٹر عبدالرحمن فلاحی	۲	۲۴۴_۲۴۶
اوراق سیرت	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	۳	۳۶۵_۳۷۰
دور جدید میں سیرت نگاری کے رجحانات	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۳	۳۷۰_۳۷۲
اشاریہ برہان دہلی	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۳	۳۷۲_۳۷۴
اِقسام الاَیمان فی اقسام القرآن	ڈاکٹر الطاف احمد مالانی	۴	۴۸۹_۴۹۰
معرفۃ الحرام فی شریعۃ الاسلام	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۴	۴۹۰_۴۹۱
تصوف کی حقیقت	جناب محمد اسعد فلاحی	۴	۴۹۱_۴۹۴
فکر اسلامی کا ارتقاء	محمد طارق ایوبی ندوی	۴	۴۹۴_۴۹۸
خبر نامہ ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی (۱)	ادارہ	۱	۱۱۹_۱۲۰
(۲)	''	۲	۲۴۷_۲۴۸
(۳)	''	۳	۳۷۵_۳۷۶
(۴)	''	۴	۴۹۹_۵۰۰

فہرست مضمون نگاران سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ جلد ۳۵، ۲۰۱۶ء

مضمون نگاران	مضامین	شمارہ	صفحات
احسن رضا، حافظ محمد	صوفیانہ تفسیری رجحان کا ارتقائ	۲	۱۴۳_۱۵۱
احمد مطلوب (بغداد)	مولانا فراہی کی تصنیف جمھرۃ البلاغۃ	۳	۳۳۹_۳۶۴
اصلاحی، ظفر الاسلام	اوراق سیرت (تبصرہ)	۳	۳۶۵_۳۷۰
اصلاحی، کلیم صفات	فیوض الحرمین۔ایک مطالعہ	۳	۲۹۳_۳۰۴
اعظمی، ابوسعد	فراہیؒ کی تصنیف جمھرۃ البلاغۃ (ترجمہ)	۳	۳۳۹_۳۶۴
الہ آبادی، محمود حسن	حسن البیان فی ما فی سیرۃ النعمان	۱	۲۷_۴۹
امتیاز احمد	میڈیکل انشورنس سے متعلق فقہی اکیڈمیوں	۱	۵۱_۶۶
تنویر قاسم	حضرت عیسیٰؑ کی تعلیماتِ امن	۴	۴۰۳_۴۲۰
جاں نثار معین	مصر میں آزادی نسواں کی تحریک	۴	۴۲۱_۴۴۰
حسان، محمد انس	شبلی کی سیرت نگاری کا تنقیدی جائزہ	۳	۲۶۹_۲۹۲
ڈنفر، احمد وون	مغرب کو اسلام کا تحفہ	۱	۹۵_۱۰۶
رضوان خان، محمد	اقبال اور دبستان شبلی (تبصرہ)	۱	۱۱۵_۱۱۶
سعدیہ گلزار	معاشی فلاح و بہبود کا اسلامی تصور	۲	۲۰۱_۲۱۶
شہاب الدین، محمد	Empowerment of Women (تبصرہ)		۱۱۳_۱۱۵
عامر، محمد امین	امیر خسرو کی تصنیف، خزائن الفتوح	۲	۱۶۹_۱۷۵
عمری، سید جلال الدین	اسلام کا فکری انقلاب اور دور حاضر کے تقاضے	۴	۳۸۹_۴۰۱
"	دعوتِ دین کے اصول و آداب	۲	۱۳۳_۱۴۲
"	صلاحیتوں کو پہچاننے اور ترقی دینے کی ضرورت	۳	۲۶۱_۲۶۷
"	مولانا شبلیؒ، امت مسلمہ اور دار المصنفین	۱	۵_۱۱
فلاحی، توقیر عالم	شیخ ابن عربی اور ان کی تفسیر	۲	۲۱۷_۲۲۹

فلاحی، ضیاءالدین	مغرب کو اسلام کا تحفہ (ترجمہ)	۱	۹۵_۱۰۶
فلاحی ،عبدالرحمن	زندگی کا خزانہ (تبصرہ)	۲	۲۴۴_۲۴۶
فلاحی، عبیداللہ فہد	اسلامی تحریکوں کی علمی وفکری ترجیحات	۴	۴۶۳_۴۸۹
فلاحی، محمد اسعد	تصوف کی حقیقت (تبصرہ)	۴	۴۹۱_۴۹۴
‘‘	سیرت طیبہ (تبصرہ)	۱	۱۱۱_۱۱۲
قاسمی،،اختر امام عادل	امام اوزاعیؒ کا علمی مقام	۱	۶۷_۹۴
قاسمی ،ظفر دارک	اسلامی ریاست میں مذہبی آزادی	۴	۴۴۱_۴۶۲
قاسمی، محمد شمیم اختر	مسلم دور حکومت کے علماء وصوفیہ۔۔۔	۳	۳۱۹_۳۳۸
قریشی ،عقیل احمد	شیخ محمد عبدہ کی تجدیدی فکر۔۔۔	۱	۱۳_۲۶
کریمی ،محمد جرجیس	اسلامی ریاست میں ادارۂ احتساب	۲	۱۵۳_۱۶۸
مالانی ،الطاف احمد	اِقسام الایمان فی اقسام القرآن (تبصرہ)	۴	۴۸۹_۴۹۰
محمد افضل	توحید خالص کا تصور۔صحف سماوی میں	۳	۳۰۵_۳۱۸
ندوی ،محمد رضی الاسلام	ارشاد السلیم الی علوم الحدیث (تبصرہ)	۱	۱۰۷_۱۰۸
‘‘	اشاریہ ’برہان دہلی (تبصرہ)	۳	۳۷۲_۳۷۴
‘‘	امت مسلمہ: مشن اور خود شناسی (تبصرہ)	۱	۱۱۰_X
‘‘	دور جدید میں سیرت نگاری کے رجحانات (تبصرہ)	۳	۳۷۰_۳۷۲
‘‘	ماہنامہ شمس الاسلام (امین احسن اصلاحی نمبر) (تبصرہ)	۱	۱۱۶_۱۱۷
‘‘	محمد ﷺ عصر حاضر کے پیغمبر (تبصرہ)	۲	۲۳۱_۲۳۷
‘‘	معرفۃ الحرام فی شریعۃ الاسلام (تبصرہ)	۴	۴۹۰_۴۹۱
‘‘	نماز کے اختلافات اور ان کا آسان حل (تبصرہ)		۱۰۸_۱۱۰
ندوی ،محمد طارق ایوبی	تہذیب وسیاست کی تعمیر میں۔۔(تبصرہ)	۲	۲۳۸_۲۴۴
‘‘	فکر اسلامی کا ارتقاء (تبصرہ)	۴	۹۴_۴۹۸
ندوی ،محمد قمر الزماں	اعضاء واجزاء انسانی کا عطیہ	۲	۱۷۷_۱۹۹

ISSN:2321-8339

Organ of Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami

Quarterly

TAHQEEQAT-E-ISLAMI
ALIGARH

Vol. 35 No.4
October - December 2016

Editor
Syed Jalaluddin Omari

Asstt. Editor
Muhammad Raziul Islam Nadvi

Nabi Nagar (Jamalpur), P.O. Box: 93
ALIGARH - 202 002 (INDIA)
www.tahqeeqat.net Email: tahqeeqat@gmail.com

CONTENTS

1. **Ideological Revolution of Islam and Requirements of the Present Age** 5
   Syed Jalaluddin Omari

2. **Jesus Christ's Teachings of Peace** 19
   Dr. Tanveer Qasim

3. **Movement of Women's emancipation in Egypt and its impact** 37
   Dr. Jan Nisar Moin

4. **Religious Freedom in Islamic State** 57
   Dr. Zafar Darik Qasmi

5. **Academic and Ideological Priorities of Islamic Movements** 79
   Dr. Obaidullah Fahd Falahi

6. **Book Reviews** 105

7. **Activities of Idara-e- Tahqee-o-Tasneef-e-Islami** 115

8. **Annual List of Articles & Authors** 117

Abstract of the Articles

Ideological Revolution of Islam and Requirements of the Present Age

Maulana Syed Jalaluddin Umari
President Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef and Ameer Jamaat-e-Islami Hind

Students Islamic Organisation of India (SIO), an All India students organisation running under the patronage of Jamaat-e-Islami Hind, organised an international conference on the theme 'India International Islamic Academic Conference', at India Islamic Cultural Centre, New Delhi on 8-9 October 2016. Besides the research scholars of various universities in the country, a number of scholars and intellectuals from abroad also participated in the conference. Some extracts of the keynote address Maulana Syed Jalaluddin Umari, as patron of the organisation, delivered in the Inaugural Session of this conference have been presented in this article.

In the beginning, the Maulana said that Islam has stressed the importance of education. It proves its truthfulness with solid arguments. It invites people to think and enjoins them to apply their wisdom and insight. Islam has given man this right much before. Then he talked on some of the issues that have got much importance in the modern age, for

example world peace, jihad, relationship between Muslims and Non-Muslims, and the problems of Muslim minorities in the various countries, etc. In the end, he stressed the need for highlighting the authenticity of Islamic beliefs and its system of Shari'ah in the language of the age and in a manner befitting the modern academic and research standard so that the objections raised thereto might be addressed properly and the new generation of Muslims getting influenced with the erroneous thoughts and trends of the modern age might be protected.

Jesus Christ's Teachings of Peace

Dr. Tanveer Qasim
Asst. Professor, Dept. Of Islamic Studies,
University of Eng. & Technology, Lahore
tanveerqasim@yahoo.com

Undoubtedly, every religion of the world calls for peace. Either revealed or non-revealed religion, the prophet of every religion declared peace and tolerance as the pivotal point for welfare and betterment of humanity. In the same way, Jesus Christ enjoined his followers to restrain themselves from committing atrocities and violence and to create an environment of truthfulness. Moreover, he advised his pupils to shun the behaviour of hatred and prejudice and to forgive their brothers even 70 times. But today, contrary to the teachings of the founders of religions, terroristic and violent behaviour is rampant among the followers. To these followers, personal interests are more attractive than human brotherhood. The basic purpose of this article is to present a noble example

from the teachings of Jesus Christ in the light of four gospels. It is need of the hour to raise the voice of truth and peace that was raised by the real well-wishers of the community.

Movement of Women's emancipation in the Egypt and its impact

Dr. Jan Nisar Moin

Dept. of Women's Studies,

Maulana Azad National Urdu University Hyderabad-32

jannisarmoin1@gmail.com

The women's lib movement started in the west. The main objective of this movement was to resolve women related issues like women's rights, gender equality, women education, etc. Its development and expanse can be traced in the literary, political, social and economic societies of other countries. Its effects are palpable in the works of international literature. This article makes an attempt to trace the influence of women's lib movement in the literary works of Egypt. The women's lib movement was important in the academic and literary environs of Egypt which comprised political, Islamic, civilizational, literary, critical and lingual movements. It influenced not only the academic and literary environs but the Muslim society as well. Whether prose or poetry, its effects were there in every genre. This western concept of women's lib gained roots in Egypt as a result of the influences of French culture and civilization over there. When France attacked Egypt under the leadership of Napoleon Bonaparte in 1791, it brought a revolution in the academic and literary, political and ideological as well as economic lives there. It left deep influence on the Egyptian society. When did Egyptian

women step into the practical field? Why was there conflict between pro- and anti-Hijab trends? When and what measures were taken for women rights? This article attempts to answer these questions in the light of Arabic literary works.

Religious Freedom in Islamic State

Dr. Zafar Darik Qasmi

Dept. of Theology (Sunni), Aligarh Muslim University, Aligarh

zafardarik85@gmail.com

Some people say that Islam does not sanction religious freedom. This objection is baseless. Islam accepts freedom of religion, and deems it the duty of the State to grant all its citizens freedom to religious belief, traditions and expression.

The Qur'?n has declared in unambiguous terms that there will be no force or coercion in matters of faith. An Islamic State cannot compel its citizens to accept Islam; they will have the freedom to practise their respective personal laws. The Qur'?n forbids its followers to say ill of the deities of others. It enjoins believers to provide a non-Muslim with an opportunity to understand Islam even during war. The Non-Muslims living in an Islamic State have been permitted to construct new places of worship. Similarly, Non-Muslims can enter mosques and worship as they like. However, due to certain expediencies, they are not allowed to enter the premises of the two Holy Mosques.

This article discusses all these issues and proves in the light of the Qur'?n, Had?th and Fiqh that Non-Muslims living in an Islamic State enjoy full freedom to practise their religion.

Academic and Ideological Priorities of Islamic Movements

Dr. Obaidullah Fahd Falahi
Professor, Dept. of Islamic Studies, Aligarh Muslim University, Aligarh
drfahadamu@gmail.com

The Islamic Movements the world over have tried to activate Muslims with respect to family and society, politics and civilization and all other spheres of life, much more than beliefs and worship; and have devised policies and programmes to go in concord with the various issues in the changing scenario.

Agreeing to democracy in the political field, participation in electoral process, seeking share of Muslims in the political system, rendering services to administrative institutions were such issues for which the Islamic Movements had reservation till the recent past but then they started having change in their opinions. They felt the need for having contact with the followers of other religions in the plural society. Earlier, the activities of Muslim women were confined to their houses. Islamic Movements felt the need that they render their services outside their homes as well. Similarly, Islamic Movements laid emphasis on having lingual and social contacts with Non-Muslims instead of considering them enemies and having total disconnect with them.

This article discusses and analyses the thoughts and opinions of the representative personalities of Islamic Movements of Egypt, Tunisia, India and Pakistan on the above mentioned issues.

BOOK REVIEWS

1. *Iqsamul Aiman fi Aqsamil Quran* (Classification of Oath in Quran),V.Abdur Rahim.Darul Qalam, Damuscus,2016,Pages 126,Price not mentioned. Reviewed by Dr. Altaf Ahmad Malani

2. *Marifat al-Haram fi Shariyat al-Islam* (The Unlawful in Islam) by Maulana Muhammad Asad Azmi, Educational Book House Delhi, 2016. Pages:272, Price IRs.120/-
Reviewed by Dr. Muhammad Raziul Islam Nadvi

3. *Tasawwuf ki Haqeeqat* (The Reality of Mysticism),by Prof. Maqsood Ahmad, Hazrat Peer Mohammad Shah Library and Research Center, Ahmadabad, Gujrat, Pages:128, Price:IRs.120/-
Reviewed by Mr. Asad Falahi

4. *Fikr-e-Islami ka Irtiqa* (Hindustan ka Khususi Mutala(Evolution of Islamic Thought,(With Special Reference to India) by Dr. Ziauddin Malik Falahi,Institute of Objective Studies,New Delhi, 2016. Pages:230, Price not mentioned.
Reviewed by Dr. Muhammad Tarique Ayyubi Nadvi

R.No. 38933/81

Quarterly
Tahqeeqat-e-Islami
Aligarh

October 2016

Mob. +91-8126677681
Phone: 0571-2902034

December 2016

مولانا سید جلال الدین عمری کی مطبوعات

شمار	نام کتاب	قیمت	شمار	نام کتاب	قیمت
۱	تجلیات قرآن	۳۲۵/	۲۲	اوراق سیرت	۲۵۰/
۲	اسلام - انسانی حقوق کا پاسبان	۹۰/	۲۳	خطبات پاکستان	۱۰۰/
۳	غیر اسلامی ریاست اور مسلمان	۲۵/	۲۴	عصر حاضر میں اسلام کے علمی تقاضے	۵۴/
۴	کمزور اور مظلوم اسلام کے سایہ میں	۵/	۲۵	انسان اور اس کے مسائل	۳۰/
۵	صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات	۲۵/	۲۶	اسلام اور مشکلات حیات	۲۵/
۶	خدا اور رسول کا تصور - اسلامی تعلیمات میں	۱۳۰/	۲۷	خدا کی غلامی - انسان کی معراج	۱۳/
۷	معروف و منکر	۱۸۵/	۲۸	اسلام اور وحدت بنی آدم	۱۶/
۸	اسلام کی دعوت	۲۰۰/	۲۹	اسلام میں خدمت خلق کا تصور	۱۱۰/
۹	غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق	۱۸۵/	۳۰	انفاق فی سبیل اللہ	۳۵/
۱۰	تحقیقات اسلامی کے فقہی مباحث	۱۰۰/	۳۱	دولت میں خدا اور بندوں کا حق	۱۶/
۱۱	عورت - اسلامی معاشرے میں	۱۸۰/	۳۲	انسانوں کی خدمت - اسلام کی نظر میں	۱۶/
۱۲	مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ	۱۰۰/	۳۳	جماعت اسلامی ہند - پس منظر، خدمات اور طریقۂ کار	۳۵/
۱۳	عورت اور اسلام	۶۰/	۳۴	ہم تحریک اسلامی کے کارکن کیسے بنیں؟	۱۵/
۱۴	اسلام کا عائلی نظام	۹۰/	۳۵	ملک و ملت کے نازک مسائل اور ہماری ذمہ داریاں	۳۲/
۱۵	مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں	۳۵/	۳۶	یہ ملک کدھر جارہا ہے؟	۲۰/
۱۶	قرآن کا نظام خاندان	۲۲/	۳۷	وقت حساب	۱۵/
۱۷	بچے اور اسلام	۱۰/	۳۸	خاندان کی اصلاح اور اولاد کی تربیت	۲۰/
۱۸	اسلام - ایک دین دعوت	۱۰/	۳۹	فقہی اختلافات کی حقیقت	۱۵/
۱۹	دعوت و تربیت - اسلام کا نقطۂ نظر	۵۵/	۴۰	بعض اہم اسلامی اصطلاحات کی تشریح	۱۸/
۲۰	ہندوستان میں اسلام کی دعوت - چند مسائل	۵/	۴۱	سوئے حرم چلا	۳۲/
۲۱	قرآن مجید کا تصور تزکیہ	۱۸/	۴۲	دینی علوم کی تدریس	۱۳/

ملنے کے پتے:
۱- ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، نبی نگر، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ ۔ ۲
۲- مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ڈی - ۳۰۷، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی ۔ ۲۵

Design by Faiz Ahmad